بدلی میں چھُپا چاند

ڈاکٹر رینو بہل

بدلی میں چھپا چاند

ڈاکٹر رینو بہل

بدلی میں چھپا چاند

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر رینو بہل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۲

1505, Sector, 49-B,
Pushpac Complex,
Chandigarh - 160047
E-mail: renubehl06@gmail.com
Phone : 0172-2631077

اشاعت	:	۲۰۱۲ء
قیمت	:	دوسَو روپے
کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
تعداد	:	چارسَو
سرورق	:	انعم آرٹس، دہلی
ناشر	:	ڈاکٹر رینو بہل
مطبع	:	ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

ISBN 978-81-8042-241-6

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

ناشر:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹-گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

فہرست

مصنّفہ کے بارے میں

نام : ڈاکٹر رینو بہل

والد کا نام : سورگیہ شری اے.بی.بہل

والدہ کا نام : شریمتی اوناش بہل

پیدائش : 6/اگست 1958ء

پتہ : 1505، سیکٹر-49B، چنڈی گڑھ-160047

تعلیمی لیاقت : ایم.اے.(پبلک ایڈمنسٹریشن)

ایم.اے.(پولیٹکل سائنس)

ایم.اے.(اُردو)(گولڈ میڈلسٹ)

پی.ایچ.ڈی(۲۰۰۰ء)بعنوان:'عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ' پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ سے

ادبی خدمات:

- 1996ء سے اُردو میں متواتر کہانیاں لکھ رہی ہیں جو ملک کے مؤقر جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔
- 2001ء میں اُردو کہانیوں کا مجموعہ 'آئینہ' کے عنوان سے شائع ہوا، جسے یوپی اُردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ ناشر: بہل پبلی کیشنز، چنڈی گڑھ
- 2003ء میں لالہ جگت نارائن ایوارڈ سے بھی نوازی جا چکی ہیں۔
- 2005ء میں دوسرا افسانوی مجموعہ 'آنکھوں سے دل تک' کے عنوان سے شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-2
- 2008ء میں تیسرا افسانوی مجموعہ 'کوئی چارہ ساز ہوتا' کے عنوان سے شائع ہوا جسے یوپی اُردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-2
- 2010ء میں چوتھا افسانوی مجموعہ 'خوشبو میرے آنگن کی' شائع ہوا۔ ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-2
- نصیر سلونی ادبی سوسائٹی، رائے بریلی نے 2010ء میں 'امرتا پریتم سمرتی سمان' سے نوازا
- 'رینو بہل کی افسانہ نگاری' موضوع پر جمّوں یونیورسٹی سے مصنّفہ پر ایم.فل کیا جا رہا ہے۔

مجھے کہنا ہے کچھ...

یہ بات پڑھی بھی تھی اور سنی بھی تھی کہ ''ادب زندگی ہے۔'' مگر اس کی صداقت کو پہچاننے میں دیر لگی۔ مانا کہ ادب میں ہمیں معاشرے کی عکاسی نظر آتی ہے۔ صحت مند ادب صحت مند معاشرے کے لیے نہایت ضروری ہے، مگر یہ نہیں جانا تھا کہ ادب انسان کے سوچنے اور جینے کا نظریہ کس قدر بدل دیتا ہے۔ ان سب باتوں کی اہمیت کو اپنی ذاتی زندگی سے جوڑ کر دیکھا تو جانا کہ ادب نے میری زندگی کو نئے معنی دیے ہیں۔ ادب برائے ادب نہیں میرے لیے ادب زندگی ہے۔ زندگی کبھی ایک ہی سیدھے راستے سے ہو کر نہیں گزرتی، کئی اُتار چڑھاؤ پار کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی ہم ڈگمگا جاتے ہیں، کبھی پھسل جاتے ہیں، کبھی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں، تو کبھی سنبھل بھی جاتے ہیں۔ مایوسیوں کے کچھ ایسے ہی بادل میری زندگی پر بھی چھائے مگر بروقت میرے ہاتھوں نے قلم تھام لیا اور میں نے ان بادلوں کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ میں نے قلم کا سہارا کیا لیا اُس نے مجھے ''میں'' کے حصار سے نکال کر دُنیا میں لا کھڑا کیا۔ جب دُنیا کا دُکھ دیکھا تو خود میں شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے رائی کو پہاڑ بنا کر رکھ دیا تھا۔ اپنے معاشرے پر نظر ڈالی تو اس پروردگار کی رحمتوں کا شکر کرنے کو میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ میں ''میں'' کی دُنیا سے باہر کیا نکلی کہ میری سوچ کا دائرہ وسیع تر ہو گیا پہلے میں اپنے دُکھ سے دُکھی ہوتی تھی، اب دُنیا کے دُکھ پریشان کرتے ہیں اور پھر قلم خود بخود میرے ہاتھوں کی طاقت بن جاتا ہے۔ میرا قلم ساری تکلیف اپنے اندر سمیٹ کر کاغذ پر بکھیر دیتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک الگ ہی تخیل کی دُنیا بس گئی ہے۔ میں اپنے آپ سے اتنی دُور نکل آئی ہوں کہ اب مجھے اپنا کچھ نظر نہیں آتا جو کچھ بھی ہے ''ہمارا'' ہے۔ اس قلم نے مجھے ادب سے وابستہ کیا اور افسانوں کے ذریعے میں مایوسی کی تاریک راہوں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکی۔ میری قلم

کاری ایسے سفر پر ہے، جس میں کبھی خوشی، کبھی غم، کبھی اُمید، کبھی نا اُمیدی کے ہمراہ آنے والے کل کو گزرے ہوئے کل سے زیادہ خوبصورت، زیادہ پروقار اور زیادہ بامعنی دیکھنے کی خواہش ہے۔

اُردو زبان سے بے انتہا محبت ہے اسی لیے اُردو میں ہی افسانے لکھے۔ اس زبان نے مجھے نئی شناخت دی ہے۔ ایک الگ حلقہ ہے میرے جاننے والوں کا جن کا بے پناہ خلوص مجھے نصیب ہوا۔

میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس سفر میں بہت سے نامور، معروف اور تجربہ کار ادیبوں کی سرپرستی نصیب ہوئی، جنھوں نے میری رہنمائی بھی کی اور حوصلہ افزائی بھی کہ آج میں اس قابل بن سکی کہ اپنا پانچواں افسانوی مجموعہ 'بدلی میں چھپا چاند' منظرِ عام پر لانے کی جسارت کر رہی ہوں۔ چند ایسے نام ہیں جن کا ذکر کیے بغیر میری بات مکمل نہیں ہوگی۔ سب سے پہلے میں اپنے استاد مرحوم ڈاکٹر ہارون ایوّب کا نام لوں گی جنھوں نے مجھے اُردو حروف اور اُردو زبان سے آشنا کرایا۔ اُن کے ساتھ ساتھ میں ڈاکٹر شباب للت، جناب کشمیری لال ذاکر، جناب رتن سنگھ اور جناب مہندر پرتاپ چاندؔ کی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

میرے اِردگرد، میرے دوست احباب، یہاں تک کہ میرے خود کے گھر میں اُردو پڑھنا کوئی نہیں جانتا۔ کئی بار وہ اصرار کرتے ہیں کہ میں ہندی یا پنجابی میں کیوں نہیں لکھتی؟ لکھ تو میں سکتی ہوں مگر اس عشق کا کیا کروں جو اُردو زبان سے ہے اور پھر اُردو کا قرض بھی ہے مجھ پر۔ اسی لیے اپنے علاقے میں اس زبان کو زندہ رکھنا میرا مقدّس فریضہ ہے۔ اندھیرے کو مٹانے کے لیے کبھی کبھی ایک دیے کی لَو بھی کافی ہوتی ہے۔ کوشش یہی رہے گی کہ جب تک سانسیں چلتی رہیں میری اُردو سے محبت ایسے ہی زندہ رہے۔ میرے ہاتھوں سے قلم نہ چھوٹے اس کے لیے آپ کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا سہارا میرے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جینے کے لیے سانس لینا۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی میرے قلم کی خوراک ہے اور اُمید کرتی ہوں کہ یہ مجھے تازندگی ملتی رہے گی!

—— ڈاکٹر رینو بہل

پت جھڑ کے بعد

لان میں بچھی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اُس نے پھولوں سے لدی کیاریوں کو نہارا۔ آج بھی رنگ برنگے پھول ویسے ہی کھلے ہیں۔ آج بھی ان کی دیکھ بھال ویسے ہی ہوتی ہے جیسے موہنی چاہتی تھی۔ خوشنما پھولوں کی محفل جوہی، چنبیلی، گلاب، رات کی رانی، بگن بیلیا، گینداا اور نرگس سے سجی ہوئی تھی۔ موہنی تو رات کی رانی کی خوشبو کی دیوانی تھی۔ وہ ان پھولوں کو دیکھتا تھا تو موہنی کا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ جب رات کی رانی کی خوشبو رات کے سناٹے میں اس کے کمرے تک کو مہکا دیتی تو اُسے موہنی کا وجود اپنے پاس ہونے کا احساس ہوتا۔ وہ تو خوشبو کی طرح اس کی نس نس میں پھیل گئی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لان میں ہی آ بیٹھتا تھا۔ سردیوں کی نرم دُھوپ اُس کی بوڑھی ہڈّیوں کو سینک دینے کا کام کرتی اور اُسے لگتا اُس کی ہڈّیوں کی ٹکور ہو رہی ہے۔ آرام ملتے ہی اُس کی آنکھیں مُندنے لگتیں اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی ستا لیتا۔ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر آرام کرنا اُسے قطعی پسند نہ تھا۔ جیسے جیسے دُھوپ وہاں سے پھسلتی جاتی اُس کا وہاں بیٹھنا دُشوار ہوتا جاتا۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر دھیرے دھیرے اپنے کمرے میں آ جاتا۔ کمرے میں آتے ہی تنہائی کا احساس اُسے ستانے لگتا اور وہ گھبرا کر ٹی وی آن کر دیتا۔ ٹی وی کی آوازیں اُسے تنہائی کی کیفیت سے کچھ راحت فراہم کرتیں۔ جب اُس نے اتنی بڑی کوٹھی بنوائی تھی تو ماسٹر بیڈ روم ایک کونے میں بنوایا تھا تاکہ اُس کے آرام میں خلل نہ پڑے اور آج اسی کونے نے اُسے سب سے الگ کر دیا تھا۔ اپنے کمرے میں بیٹھے

ہوئے اُسے کسی کے آنے جانے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ بیٹا کب آتا ہے، بہو کب جاتی ہے اور کوئی اُس کے پاس آنے کی زحمت بھی نہیں کرتا۔ کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے سبھی زندگی کی دوڑ میں شامل ہیں۔ اور اُس کے پاس تو وقت ہی وقت ہے، اُوپر سے کرنے کو کچھ بھی نہیں۔ گھر میں اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل تنہا ہے۔ البتہ ایک نوکر ضرور ہے جو وقت پر کھانا اور دوائی دے جاتا ہے، مگر بات کرنے کا وقت اُس کے پاس بھی نہیں۔ جب تک موہنی اُس کے ساتھ تھی وہ مالک تھا، گھر کے راجا کی طرح جیتا تھا۔ موہنی کے ہاتھوں میں اِس گھر کی باگ ڈور جو تھی۔ جوان بیٹا بھی اپنی کمائی ماں کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ کیا مجال بیٹے یا بہو کی جو ماں کے کسی فیصلے کی مخالفت کریں۔ مخالفت تو کبھی اُس نے بھی نہیں کی تھی بیوی کے کسی فیصلے کی۔ موہنی تھی ہی اتنی سلجھی ہوئی اور سمجھدار کہ اُس نے کبھی کسی کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُس نے اس سلیقے سے گھر چلایا کہ دونوں بیٹے آج کامیاب زندگی گزار رہے ہیں اور رہنے کو اتنا بڑا مکان۔

بلدیوراج اور موہنی نے اپنی شادی شدہ زندگی کی شروعات دو کمروں کے فلیٹ سے کی تھی۔ موہنی کے قدم اُس کی زندگی میں پڑتے ہی اُس کے گھر میں لہر بہر ہوگئی۔ محنتی تو وہ تھا ہی اوپر سے قسمت نے بھی بڑا ساتھ دیا۔ وہ جو بھی کما کر لاتا، آ کر موہنی کو تھما دیتا۔ اُس کا سوچنا تھا کہ گھر کی لکشمی کے پاس ہی گھر کا خزانہ ہونا چاہیے۔ اس سے گھر میں برکت رہتی ہے۔ جب اُن کے گھر پہلی اولاد نے جنم لیا تو گھر میں بہار آ گئی۔ اب اُسے یہ فلیٹ چھوٹا لگنے لگا تھا۔ جب دیپک چھوٹے چھوٹے قدموں سے گھر میں بھاگتا تو کسی نہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر جاتا۔ ننھی سی جان چوٹ لگنے سے رو رو کر گھر کو آسمان پر اُٹھا لیتی۔ ماں اُسے پیار سے سینے سے لگا لیتی اور تھپکی دے کر چپ کرانے لگتی اور اگر یہ سب باپ کی موجودگی میں ہوتا تو وہ خود کو کوسنے لگتا۔ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر دیکھ کر وہ بھانپ جاتی کہ وہ خود سے خفا ہے۔ اُسے تسلی دیتے ہوئے کہتی:

"بچہ شرارت کرے گا تو چوٹ بھی لگے گی۔ گر گر کر ہی تو بڑا ہوگا۔ آپ کیوں پریشان

ہوتے ہو۔''

''کیسا باپ ہوں میں اپنی اولاد کو کھلا آنگن بھی نہیں دے سکتا کھیلنے کو۔''

''کوئی بات نہیں، بھگوان نے چاہا تو وہ بھی مل جائے گا۔ آپ بس حوصلہ رکھو۔''

عموماً مرد اپنی بیوی کو جاہل، بے وقوف سمجھتے ہیں مگر وہ ایسا نہ تھا۔ بیوی کی باتوں سے اُسے بہت تسلی ملتی۔ اُس کے مشورے کے بغیر وہ کچھ نہ کرتا۔ آنکھ موند کر اُس پر یقین کرتا تھا۔ موہنی اُس کی سب سے بڑی کمزوری بھی تھی اور طاقت بھی۔ چراغ کی پیدائش سے پہلے ہی وہ بڑے فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ اُس کا کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا اور وہ اُسے اور زیادہ پھیلانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا تاکہ اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو دنیا کا ہر سکھ دے سکے۔ موہنی نے بھی شادی کے بعد پلٹ کر کبھی اپنے مائیکے والوں کو نہ دیکھا۔ اُس کی تو بس چھوٹی سی دنیا تھی جو دونوں بیٹوں کے اِرد گرد سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی اس کائنات میں خوش بھی تھی۔

دیپک نے ایم. بی. اے کیا تو اُسے ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری مل گئی۔ ماں باپ تو یہی چاہتے تھے کہ وہ اپنے کاروبار میں اُن کا ہاتھ بٹائے مگر دیپک اپنی الگ پہچان بنانا چاہتا تھا۔ بلدیوراج نے آج تک اُس کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی، بڑے لاڈ پیار سے اُسے پالا تھا۔ بیٹے کی اس خواہش کے آگے اُس نے سر خم کر دیا مگر موہنی نے اس کی خوب مخالفت کی۔

''کیا کمی ہے ہمارے پاس جو اُسے دوسرے کی نوکری کرنی پڑے۔ ایم. بی. اے اس لیے کروائی تھی کہ اپنے کاروبار میں کام آسکے۔''

''مان جاؤ موہنی اگر وہ نوکری کرنا چاہتا ہے تو بُرا ہی کیا ہے۔''

''آج وہ نوکری پر جائے گا کل وہ ہمیں چھوڑ کر دوسرے شہر پھر دوسرے ملک چلا جائے گا۔ اگر ایک بار وہ گھر سے چلا گیا تو بس مہمان بن کر ہی آئے گا۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ کچھ سال نوکری کا شوق پورا کر کے لوٹ آئے گا۔''

''آپ غلط سوچ رہے ہو۔ ایک بار جو پرندہ اپنا گھونسلہ چھوڑ کر جاتا ہے وہ نیا گھونسلہ ہی بناتا ہے لوٹ کر نہیں آتا۔''

''وہ ہمارا لختِ جگر ہے کوئی پرندہ نہیں۔''

''خیر بحث سے کیا فائدہ، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔''

ہمیشہ کی طرح موہنی صحیح نکلی۔ دیپک کو چار مہینے بعد ہی کمپنی والوں نے امریکہ بھیج دیا اور وہ وہیں کا ہوکر رہ گیا۔ سال بھر بعد جب وہ لوٹا تو ساتھ میں اس کی ایک امریکن دوست بھی تھی۔

ٹیرسا جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا اور رشتے پر ماں باپ کی مہر بھی چاہتا تھا۔ ماں پر جب اپنی خواہش ظاہر کی تو موہنی سے رہا نہ گیا۔

''تجھے کوئی ہندوستانی لڑکی پسند نہیں آئی؟ یہ شادی سے پہلے لڑکی کو لے کر اِدھر آنے کی تو نے سوچی کیسے؟''

''رلیکس ماں، ہم دونوں ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ آج نہیں تو کل شادی کر ہی لیں گے، بس تم ہاں کر دو۔''

''اگر میں منع کر دوں تو کیا شادی نہیں کرے گا؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اور پھر ایک ساتھ بنا شادی کے رہنا اور اس طرح اُسے لے لے کر گھومنا یہ سب کیا ہے؟''

''سب چلتا ہے ماں۔ میں نے اُسے صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ اگر ماں نے انکار کر دیا تو یہ شادی ممکن ہی نہیں۔''

''تو بہت چالاک لڑکا ہے، جانتا ہے تیری ماں کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں کرے گی۔ چاہتی تو میں یہ تھی کہ اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ پورے رسم و رواج سے اپنے بیٹے کا سہرا باندھوں، مگر یہ میم...''

''میم ہے تو کیا ہوا۔ شادی تو پورے رسم و رواج کے ساتھ آج بھی ہو سکتی ہے۔ تو جب کہے میں سہرا باندھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ ماں سے ننھے بچّے کی طرح لپٹ گیا، پھر ماں کی ممتا کو پگھلنے میں وقت ہی نہیں لگا۔

دس دنوں کے اندر ہی دیپک کے سر پر سہرا سجا تھا اور ٹیرسا لال لہنگا چولی پہنے اُگنی کے

سامنے سات پھیرے لے رہی تھی۔ پورا گھر دُلہن کی طرح سجا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ماں باپ کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ماں نے دلہن کے ابھی چاؤ بھی پورے نہیں کیے تھے کہ اُن کے لوٹنے کا وقت آ گیا۔

فون کی گھنٹی بجی تو بلدیو راج خوابوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔ کب باہر اندھیرا ہو گیا اور کب نوکر آ کر کمرے کی بتّی جلا گیا اُسے پتا ہی نہ چلا۔ اکثر وہ بیٹھے بیٹھے ماضی کے جنگل میں کھو جاتا تھا بھٹکتے بھٹکتے وہ کہاں سے کہاں سے نکل جاتا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر فون اُٹھایا:

''ہیلو۔''

''راج کیسا ہے یار؟''

ایک مدّت بعد اپنے دوست کی آواز سن کر وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔

''سکسینہ! یار تو کہاں کھو گیا تھا؟ آج میری یاد کیسے آ گئی۔ کہاں ہے تُو آج کل؟''

''یار اتنے سوالوں کے ایک ساتھ جواب دینے کی اب قوت نہیں رہی۔ بہت مشکل سے تجھے تلاش کر پایا ہوں۔ میرے پاس تو تیرے پرانے گھر کا پتہ ہی تھا۔''

''تُو تو باہر چلا گیا تھا اپنے بیٹوں کے پاس، کب لوٹا؟''

''تیری ہر بات کا جواب دوں گا۔ بتا کل ملے گا صبح گیارہ بجے اُسی جگہ۔ بُھلا تو نہیں وہ جگہ؟''

''یاد ہے، سب یاد ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اب گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے۔''

''کل آ رہا ہے کہ نہیں؟''

''صبح گیارہ بجے وہی کافی ہاؤس۔ ٹھیک۔''

''بالکل ٹھیک، میں تیرا انتظار کروں گا۔''

کھانا کھانے کے بعد وہ دیر رات تک چراغ کی گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔ چراغ شاید آج بھی دیر سے لوٹے یہی سوچ کر وہ بستر پر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک مدّت ہوئی نیند سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ موہنی کا ساتھ کیا چھوٹا اُس کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ درو دیوار کو دیکھتے، کبھی زندگی کے اوراق پلٹتے رات گزر جاتی۔ جب ذہن ماضی میں بھٹک بھٹک کر تھک

جاتا تو چپکے سے نیند اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ اُسے یاد آیا کہ دیپک اور ٹیرسا کے چلے جانے کے بعد گھر میں ویرانی چھا گئی تھی۔ چراغ نے پڑھائی ختم کی تو اُس نے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے اُس نے بخوبی ساری ذمّے داری اپنے اوپر لے لی۔ اب بلدیوراج گھر بیٹھے بیٹھے ہی کام کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وقت اب وہ موہنی کے ساتھ بِتاتا۔

''ساری عمر تو بھاگتے بھاگتے ہی کٹ گئی۔ اب وقت ملا ہے تمھارے ساتھ گزارنے کا۔''

''چراغ کی شادی کے بعد ہم دونوں کہیں گھومنے چلیں گے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں ہم کب گئے تھے گھومنے۔''

''دیپک بلا رہا ہے اُسی کے پاس جائیں گے۔ اسی بہانے بچّوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور اپنی آنکھوں سے اُن کی گھر گرہستی دیکھ کر تسلّی کر لینا۔''

موہنی نے اپنی پسند کی لڑکی سے چراغ کی شادی کروا دی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی مگر کمی تھی تو بڑے بھائی اور بھابی کی۔ دیپک باپ بننے والا تھا اور اس موقع پر وہ ٹیرسا کو اکیلے نہیں چھوڑ کر آ سکتا تھا۔ سُنندا کے گھر آتے ہی گھر میں رونق آ گئی۔ بیٹی کی کمی تھی اُن کی زندگی میں وہ بہو نے آ کر پوری کر دی تھی۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی جب چراغ کی گاڑی کی آواز نے اسے بیدار کر دیا۔ بہت بار اُس نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اتنی دوڑ اچھی نہیں۔ کچھ وقت خود کے لیے اور اپنے بیوی بچّوں کے لیے بھی نکالنا ضروری ہے مگر اُس کے سر پر تو پیسے کمانے کا، کاروبار بڑھانے کا جنون سوار تھا۔ جب تک موہنی زندہ تھی سبھی رات کا کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔ موہنی کا کہنا تھا کہ جو لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں وہ ایک ساتھ ہوتے ہیں سکھ میں بھی اور دُکھ میں بھی۔ موہنی کے جاتے ہی یہ روایت بدل گئی تھی۔ سُنندا پارٹیوں میں مصروف رہتی۔ چراغ کاروبار اور پارٹیوں سے دیر سے لوٹتا۔ بچّوں کی اپنی زندگی تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ اکیلے بیٹھ کر کھانے سے بہتر ہے اپنے کمرے میں ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیا جائے۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا دو پل آرام سے بیٹھ کر اُس سے بات کرنے کا۔ چراغ جب بھی آتا گھوڑے پر سوار آتا۔ دیپک بیٹی کی پیدائش کے بعد اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ مہینے

میں ایک بار سے زیادہ اُس کا فون ہی نہیں آتا تھا۔ آٹھ سال پہلے اُس نے بیٹے کو دیکھا تھا جب وہ ماں کی اَنتیشٹھی پر آیا تھا۔ ٹیرسا تو تب بھی نہیں آئی تھی۔ دس سال کی پوتی کی اُس نے صرف تصویریں ہی دیکھی تھیں کبھی اُسے اپنے پاس بٹھانے کا، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ایک فضول سی چیز سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا۔ اُسے اپنی زندگی بے معنی اور بے مقصد لگنے لگی۔ اُسے اپنا وجود اس دھرتی پر بوجھ سے کم نہیں لگتا تھا۔ تنہائی نے اُس کی زندگی ویران اور بوجھل بنا دی تھی۔

ہر وقت اُس کے دل سے یہی دُعا نکلتی: ''میرے پرماتما اب تو اُٹھا لے مجھے۔'' مانگے سے اگر موت مل جائے تو کون جیتا ہے۔ جینا اُس کی مجبوری بن گئی۔ کسی طرح وہ دن سے رات اور رات سے دن کرتا۔ مگر جب سے سکینہ کا فون آیا تھا اُسے ایک تازہ ہوا کے جھونکے جیسا سکون محسوس ہوا۔ کوئی تو ہے اس دنیا میں جس نے اُسے یاد رکھا ہے۔

ایک مدّت کے بعد اُس نے اکیلے گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔ سُنندا نے اسے تیار ہو کر گھر سے نکلتے دیکھا مگر نہ وہ حیران ہوئی اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ وہ بھی بنا بتائے سڑک پر آ گیا۔ ٹیکسی پکڑی اور کافی ہاؤس پہنچ گیا۔ سکینہ اُس کا منتظر تھا۔ نظریں ملتے ہی دونوں تپاک سے گلے ملے اور پھر کونے والی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔

''یار سکینہ! تیری عمر تو آگے بڑھنا ہی بھول گئی۔'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اور مجھے لگتا ہے وہ جو میرا گھر بھُولی تھی اُسے تو نے اپنا پتہ دے دیا تھا۔ میں ستّر سال کا نوجوان لگتا ہوں مگر تو اسّی سال کا بوڑھا۔'' دونوں ہنس پڑے۔

''تم تو باہر چلے گئے تھے اپنے بیٹوں کے پاس۔ کب لوٹے؟''

''ابھی چار مہینے پہلے ہی واپس آیا ہوں۔''

''چار مہینے ہو گئے اور میری یاد اب آئی؟''

''یاد تمھاری گئی ہی کہاں جو لوٹ کر آتی۔ دراصل کچھ ضروری کام نپٹانے تھے اُسی میں مصروف رہا۔ یار زندگی اُلجھ سی گئی تھی، اُسے ہی سلجھانے میں لگا تھا اور پھر تم نے بھی تو پرانا گھر بدل لیا۔ کب بدلا؟''

''چراغ کے گھر جب دوسری اولاد ہوئی تو موہنی کہنے لگی کہ گھر بڑا ہونا چاہیے۔ کل کو دیپک، بہو اور پوتی کو لے کر آئے گا تو گھر چھوٹا ہو جائے گا۔ بات میں اُس کی وزن تھا۔ پھر بڑی کوٹھی کا من بنا لیا تو اُسے خریدنے کا ذریعہ بھی بن گیا۔''

''چلو اچھا ہے پریوار بڑھ رہا ہو تو مکان بھی بڑھا لینا چاہیے۔ بھابھی کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی بڑے بڑے لان والی کوٹھی کی۔''

''ہاں، شکر ہے اُس کی یہ خواہش پوری کر سکا یہ بات اور ہے کہ اُسے زیادہ موقع نہیں ملا اس میں رہنے کا۔''

''مجھے پتہ تو چلا تھا موہنی بھابھی کے بارے پر تم سے بات کرنے کی ہمّت ہی نہیں ہوئی۔ تجھ پر کیا بیتی ہوگی میں سمجھ سکتا ہوں۔ مگر یار ہمیشہ کون ساتھ چلتا ہے۔ اکیلے آئے ہیں اکیلے جائیں گے۔ آج اُس کی کل ہماری باری ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں پر اس خلا کا کیا کروں، اس تنہائی سے کیسے جان چھڑاؤں جو دن رات سائے کی طرح ساتھ لپٹ گئی ہے۔''

''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں، کتنا سچ کہا ہے چچا غالب نے۔''

''ہر وقت موت کی دُعا کرتا ہوں مگر اب تو وہ بھی نہیں سنتی۔''

سنجیدہ ماحول کو کچھ ہلکا کرنے کے لیے سکسینہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے بولا:

''یار تو جوانی کے دن بھول گیا کیا؟ موت بھی کسی حسینہ سے کم نہیں۔ جتنا اس کے پیچھے بھاگو گے اُتنا دھتکارے گی اور اگر تم اُس کے وجود کو نظر انداز کر دو تو پھر دیکھنا ایک روز اچانک اُسے تمھاری یاد ستانے لگے گی۔''

''جینا مجبوری بن گئی ہے ورنہ وہ مزا نہیں رہا۔ موہنی جاتے جاتے سب کچھ سمیٹ کر ساتھ لے گئی۔''

''اپنی تکلیف سے باہر نکل کر دیکھ، دُنیا میں کتنا دُکھ ہے۔ ہم لوگ تو بہت خوش نصیب ہیں۔ بھگوان نے سر پر چھت دی ہے اور پیسہ بھی۔ کسی کے محتاج تو نہیں ہیں۔ اُن بزرگوں

کے بارے سوچ جو صرف اولاد کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں۔ بیماری اور لاچاری جن کی تقدیر ہے۔''

''بات تو تُو ٹھیک کہہ رہا ہے مگر.....''

''اگر مگر کو چھوڑ یار۔ چل جینے کا انداز بدل دیتے ہیں۔ جتنی زندگی اوپر والے نے دی ہے خوشی خوشی گزاریں گے۔''

''وہ کیسے؟''

''جس دور سے تو گزر رہا ہے، میں بھی گزر چکا ہوں۔ میرے تجربے سے کوئی تو فائدہ اُٹھا۔ مشورہ دوں گا وہ بھی بالکل مفت۔''

پھر دونوں دوست دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سکینہ کی باتیں وہ غور سے سن رہا تھا۔ کبھی کبھی دونوں قہقہہ لگا کر ہنس بھی پڑتے۔ ایک مدّت بعد وہ اس طرح کھل کر ہنسا تھا۔ اُسے تو لگا تھا کہ وہ ہنسنا بھول گیا ہے۔ جلد ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے دونوں اپنے اپنے راستے نکل گئے۔ بلدیوراج گھر لوٹا تو خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

رات دیر تک سکینہ کی باتیں اُس کے ذہن میں گھومتی رہیں۔ اپنی زندگی کے اوراق اُلٹتا رہا۔ کبھی بچّوں کا بچپن، کبھی اُن کا لڑکپن، کبھی جوانی کے بھولے بسرے قصّے، کبھی موہنی کے ساتھ گزرے کھٹے میٹھے حسین پل۔ پھر موہنی کا بچھڑنا، دیپک کا بھولے سے بھی یاد نہ کرنا، چراغ کا پاس رہ کر بھی دُور رہنا، ان ہی اُلجھنوں میں کروٹیں بدلتے بدلتے رات کھسکتی گئی۔ صبح کی پہلی کرن نے ساری تاریکی مٹا دی۔ اُلجھنیں ذہن سے نکال پھینکیں۔ نئے اور مضبوط ارادے کے ساتھ اُس نے بستر چھوڑ دیا۔ آج وہ خود کو بوڑھا اور کمزور محسوس نہیں کر رہا تھا۔ آج بھی اُس میں قابلیت تھی کچھ نیا کر دکھانے کی۔ اُس نے اٹھتے ہی سکینہ کو فون کیا۔ اُدھر سے اونگھتی ہوئی آواز سنائی دی: ''ہیلو۔''

''سکینہ سو رہا ہے کیا؟''

''تو بول کیا کہتا ہے۔ مجھے نیند میں بولنے کی بیماری ہے۔''

''تم شام چھ بجے آنا، مَیں تیار رہوں گا۔''

''کیا؟ آج شام چھ بجے؟ تم نے دیپک اور چراغ سے بات کر لی؟'' سکینہ کی نیند پوری طرح کھل چکی تھی۔

''اس کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس انھیں اطلاع کر دوں گا۔ فون پر یا خط لکھ کر۔''

''خط لکھ کر کیوں؟ کیا چراغ گھر پر نہیں؟''

''اس کے پاس وقت نہیں میرے لیے اور اب تو میرے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ انتظار کی عادت میں نے چھوڑ دی۔''

''کب سے؟'' اُس نے ہنس کر پوچھا۔

''کل شام سے۔ تم بس چھ بجے پہنچ جانا میں تیار رہوں گا۔ رکھتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

صبح گیارہ بجے اُس نے وکیل کو گھر پر ہی بلا لیا۔ سب کام مکمل کر کے اُسے دوبارہ ملنے کو کہا۔ پھر اپنی الماری کی چھان بین شروع کی اور ضروری سامان نکال کر الگ باندھ لیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اُس نے چند لمحے لان میں پھولوں کو نہارتے گزارے اور پھر دھیرے دھیرے پہلے کوٹھی کے باہر کا پورا چکر لگایا اور پھر اندر ایک ایک کمرے کا جائزہ لیا۔ آج اس گھر میں اُس کا آخری دن تھا۔ شاید دوبارہ اس جگہ کو کبھی دیکھ پائے یا نہ دیکھ پائے۔ سُنندا روز کی طرح گھر پر نہیں تھی۔ بچوں کے کمرے میں گیا تو وہ کمپیوٹر میں گھسے ہوئے تھے۔ اُس نے بلایا تو دونوں نے مسکرا کر دیکھا اور پھر کمپیوٹر کی اور دیکھنے لگے۔ شاید کوئی گیم کھیل رہے تھے۔ وہ چپ چاپ باہر نکل آیا۔

مقررہ وقت پر وکیل صاحب پہنچ گئے اور کاغذات پر دستخط کروا کر رخصت ہو گئے۔

سب سے پہلے اُس نے دیپک کو فون لگایا، اُس کا فون آنسرنگ مشینگ پر تھا۔ اپنا پیغام ریکارڈ کرا کر اُس نے فون بند کر دیا۔

چراغ کو اس نے موبائل کیا تو اُس نے اُٹھاتے ہی کہا:

''پاپا میں ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہوں، بعد میں فون کرتا ہوں۔'' فون کٹ گیا۔

'ہمیشہ کی طرح اس بے چارے کے پاس وقت نہیں ہے باپ سے بات کرنے کا'۔
وہ خود سے ہی بڑبڑایا اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا:

''سوچا تھا جانے سے پہلے تم سے بات کرلوں مگر ہر بار کی طرح تمھارے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ تمھارا زیادہ وقت نہیں لوں گا، جانتا ہوں تمھارا وقت بہت قیمتی ہے۔ اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں کوئی بے کار شے کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں نے اور سکینہ نے نیا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گھبراؤ نہیں میں تم سے پیسہ نہیں مانگوں گا۔ کاروبار سے اپنے حصّے کے پیسے نکلوا لیے ہیں۔ میں نے اب تک پورے اختیار تمھیں نہیں سونپے تھے۔ آج سونپ رہا ہوں۔ اب سے پورے کاروبار کے تم اکیلے مالک ہو اور یہ گھر میں نے تم دونوں بھائیوں کے نام کر دیا ہے۔

یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ سکینہ نے نیا اولڈ ایج ہوم بنوایا ہے۔ ہم دونوں وہیں اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ رہیں گے اور اُن لوگوں کی مدد کریں گے جن کو دنیا میں کوئی دیکھنے والا نہیں، جن کی کسی کو ضرورت نہیں۔ تم فکر مت کرنا یہ اولڈ ایج ہوم اس شہر میں نہیں ہے اس لیے تمھاری کوئی بدنامی نہیں ہوگی۔ ویسے بھی وہاں سب مجھ جیسے ہی تو ہوں گے۔

اپنا نیا پتہ بعد میں لکھ دوں گا اگر مجھے مناسب لگا۔

ہمیشہ خوش رہو، میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ ہمیشہ۔

تمھارا پاپا
بلدیوراج''

خط لفافے میں ڈالا اور نوکر کو تھما دیا اور ٹھیک چھ بجے باہر گاڑی کا ہارن سن کر وہ گھر سے نکل آیا۔ سامان گاڑی میں رکھوا کر وہ سکینہ کے ساتھ ایک نئی شروعات کرنے نکل پڑا۔

OO

محبّت کا حق ادا ہو گیا

شام پانچ بجے کے قریب بھاسکر پریم آشرم کے گیٹ پر ایک بڑی سفید گاڑی نے آ کر ہارن بجایا تو میرا نے اپنے دفتر کے کمرے سے گیٹ مین کو گیٹ کھولتے دیکھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی اور پورچ میں آ کر رُک گئی۔ لان میں کھیلتے بچے شور مچاتے گاڑی کی طرف لپک پڑے، وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً روز ہی اس طرح کی گاڑیاں وہاں آتی تھیں۔ لوگ وہاں کے یتیم بچّوں کے لیے طرح طرح کے تحفے اور کھانے پینے کا سامان تقسیم کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے، روحانی خوشی اور دلی سکون حاصل کرنے کے لیے اس یتیم خانے کی چوکھٹ تک پہنچ جاتے تھے۔ ادھیڑ عمر کا رادھے شیام اِس آشرم کا نگراں اور کرتا دھرتا ہے۔ اندر باہر کے کاموں سے لے کر آنے جانے والوں سے ملنا اور بچوں سے ملوانا سبھی ذمّے داری وہ بخوبی نبھاتا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد رادھے شیام اُس کے پاس آیا:

''دیدی ایک صاحبہ بچوں کے لیے کچھ سامان لائی تھیں وہ تو میں نے بانٹ دیا ہے مگر وہ کچھ رقم بھی دان دینا چاہتی ہیں اپنے پِتا کی یاد میں۔''

''پوچھ کیا رہے ہو، لے آؤ اُنھیں اندر۔''

اجازت ملتے ہی وہ کمرے سے باہر لپکا اور وہ جلد سے جلد کام ختم کرنے میں لگ گئی۔ پیسے کے لین دین کا کام وہ خود ہی دیکھتی تھی۔ جب اس نے دس سال پہلے آشرم اپنی ذاتی بچت سے شروع کیا تھا اُس وقت صرف چار بچے تھے پھر دھیرے دھیرے بچوں کی تعداد

محبّت کا حق ادا ہو گیا

شام پانچ بجے کے قریب بھاسکر پریم آشرم کے گیٹ پر ایک بڑی سفید گاڑی نے آ کر ہارن بجایا تو میرا نے اپنے دفتر کے کمرے سے گیٹ مین کو گیٹ کھولتے دیکھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی اور پورچ میں آ کر رُک گئی۔ لان میں کھیلتے بچے شور مچاتے گاڑی کی طرف لپک پڑے، وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً روز ہی اس طرح کی گاڑیاں وہاں آتی تھیں۔ لوگ وہاں کے یتیم بچوں کے لیے طرح طرح کے تحفے اور کھانے پینے کا سامان تقسیم کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے، روحانی خوشی اور دلی سکون حاصل کرنے کے لیے اس یتیم خانے کی چوکھٹ تک پہنچ جاتے تھے۔ ادھیڑ عمر کا رادھے شیام اِس آشرم کا نگراں اور کرتا دھرتا ہے۔ اندر باہر کے کاموں سے لے کر آنے جانے والوں سے ملنا اور بچوں سے ملوانا سبھی ذمّے داری وہ بخوبی نبھاتا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد رادھے شیام اُس کے پاس آیا:

''دیدی ایک صاحبہ بچوں کے لیے کچھ سامان لائی تھیں وہ تو میں نے بانٹ دیا ہے مگر وہ کچھ رقم بھی دان دینا چاہتی ہیں اپنے پِتا کی یاد میں۔''

''پوچھ کیا رہے ہو، لے آؤ اُنھیں اندر۔''

اجازت ملتے ہی وہ کمرے سے باہر لپکا اور وہ جلد سے جلد کام ختم کرنے میں لگ گئی۔ پیسے کے لین دین کا کام وہ خود ہی دیکھتی تھی۔ جب اس نے دس سال پہلے آشرم اپنی ذاتی بچت سے شروع کیا تھا اُس وقت صرف چار بچے تھے پھر دھیرے دھیرے بچوں کی تعداد

بھی بڑھتی گئی اور آشرم چلانے کے لیے رقم بھی۔ کچھ گرانٹ سرکار سے مل جاتی اور باقی شہر کے امرا اپنے کھاتے میں ثواب جمع کرانے کے لیے دل کھول کر خیرات دیتے تھے۔ کچھ نام کے لیے اور کچھ گناہ اور ثواب کا توازن برقرار رکھنے کے لیے۔ ویسے بھی اُس کا یہ ماننا تھا کہ ہر شخص اپنا نصیب لے کر پیدا ہوتا ہے، اوپر والا جنم بعد میں دیتا ہے پہلے اس کے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو رادھے شیام کے ساتھ ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اُنھیں اندر آنے کو کہہ کر اُس نے فائل بند کر دی۔

"کہیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

اتنا کہتے ہوئے اس نے اس عورت کی طرف دیکھا تو ٹھٹھک گئی۔ دونوں کی نظریں کیا ملیں، چہرے کے رنگ بدل گئے۔ میرا کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اس عورت کے چہرے کی نسیں تن گئیں اور پیشانی پر سلوٹیں نظر آنے لگیں اور وہ کرسی سے اٹھنے کو تھی کہ میرا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا:

"آپ رُکیے ذرا۔ رادھے شیام تم جاؤ، میں میڈم سے بات کر لوں گی۔"

"جی دیدی۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

"کیسی ہو اپرنا؟ کیسے آنا ہوا؟"

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم یہاں پر ہو ورنہ میں کبھی اِدھر کا رخ نہ کرتی۔"

"تم مجھ سے ملنے تو آئی نہیں۔ پھر یہ سمجھ لو اس آشرم کی منیجر سے بات کر رہی ہو۔ کہو میں کیا کر سکتی ہوں تمھارے لیے؟"

"میرے لیے تم نے جو کچھ کیا اس کو میں مرتے دم تک نہ بھول پاؤں گی۔ جو زخم تم نے دیے ہیں وہ کبھی نہیں بھریں گے۔ تمھیں تو اندازہ بھی نہ ہوگا کہ ان زخموں نے کتنا درد دیا ہے ،کتنا نقصان کیا ہے میرا، یہ تمھیں کیا معلوم؟"

"میں گزری باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔ تم جس مقصد سے آئی ہو وہ بتاؤ۔" میرا کی

آواز میں کسک اور بے بسی تھی۔

''تم جن باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتیں، جن کا ذکر بھی تمھیں گوارا نہیں، اُنھی نے ہماری زندگی برباد کردی۔ ہماری خوشیوں میں آگ لگادی، ہمارا چین وسکون چھین لیا۔ میرا بچپن اور بچپن کی معصومیت چھین لی۔ مجھے آج بھی اپنی ماں کی بے بسی، اس کا خوف، اس کا بے رونق چہرہ، اُداس ویران آنکھیں یاد ہیں، وہ تل تل گُھٹتی تھی تو میرا دل روتا تھا۔ بددعائیں نکلتی تھیں تمھارے لیے، نفرت کے شعلے میری رگ رگ میں لپکتے تھے اور تم کہتی ہو تم یاد نہیں کرنا چاہتیں۔'' غصّے سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''کیا ہر بات کی ذمّے دار میں اکیلی ہوں؟'' میرا نے دبی آواز میں پوچھا۔

''ہاں! ہماری بربادی کی ذمّے دار صرف تم اور تم ہی ہو۔ آج تک میں نے ایک لفظ بھی تمھیں نہیں کہا، ڈرتی تھی میں اپنے پاپا سے مگر اب.....اب نہیں۔ پچھلے تیس سال سے نفرت کی جو آگ میرے اندر سلگ رہی ہے، تم کیا سوچتی ہو، آج کہہ دینے سے وہ آگ بجھ جائے گی۔ اس کا حساب تو تمھیں دینا ہی ہوگا۔ اس جنم میں یا پھر....''

''ہر انسان اپنے کیے کا خود ذمّے دار ہے اور اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ آج تم سے بات کرنے کا موقع ملا ہے تو میں بھی کچھ کہنا چاہوں گی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں بالکل ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی بار پیار کیا اور جی جان سے کیا...نہ اس کا نہ اس کے اپنوں کا کبھی بُرا چاہا۔ صدیوں سے یہی کہا اور سنا گیا ہے کہ پیار اندھا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے جو مجھ پر گزری ہے۔ جب پیار نے میرے دل کے دروازے پر دستک دی تو میں نے ڈر کر سبھی در بند کر دیے کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ شخص کسی اور کا ہے۔ اس کی ایک الگ دنیا ہے جس میں میں کبھی داخل نہیں ہوسکتی۔ مگر میرے لاکھ کواڑ بند کرنے پر بھی پیار تیز طوفان کی طرح دروازے کھڑکیاں توڑ کر میرے باطن میں داخل ہوگیا۔ اس آندھی نے میرے سوچنے سمجھنے کی قوت ہی ختم کردی۔ پندرہ سال عمر کا فرق بے معنی کردیا، یہ بھی فراموش کردیا ہے کہ ہم ندی کے کناروں کی طرح ایک ساتھ چل تو سکیں گے مگر مل نہیں سکیں گے۔

اس پیار نے میرے جسم اور میری روح کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ میری نس نس عشق کی چاندنی میں بھیگ گئی۔ جنون نے دیوانگی سے آشنا کر دیا۔ پھر اس کے بعد شروع ہوا ایک نیا سفر... دکھ، درد، کرب، رنج، ذلّت، رسوائی، بدنامی، بے چینی، بے قراری، بے بسی، لاچاری اور تمھاری نفرت کا سفر....''

''ان سب کی کیا تم خود ذمّے دار نہیں؟'' اپرنا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''بالکل میں ہی ہوں.... میں کسی اور کو الزام بھی نہیں دے رہی۔ مگر ایک بات ضرور کہوں گی کہ....''

دروازے پر آہٹ سن کر میرا خاموش ہو گئی۔ رادھے شیام ٹرے میں چائے لے کر آرہا تھا۔

''رادھے شیام چائے رکھ دو اور دیکھو بچوں نے اگر ہوم ورک ختم کر لیا ہو تو وقت پر پرارتھنا والے کمرے میں لے جانا۔''

چائے رکھ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

''غصہ میرا اسے ہے اس آشرم کی مینیجر سے نہیں۔ لو چائے پیو، یقین مانو کچھ ملایا نہیں اس میں۔'' اسے خاموش دیکھ کر میرا نے کہنا شروع کیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمھیں اس بات کو قبول کرنا ہی ہوگا کہ میں نے اپنا آشیانہ بنانے کے لیے کسی شاخ کو نہیں کاٹا، کھلے ہوئے پھول کو نہیں توڑا۔ میں نے اپنا گھر بھی نہیں بسایا تا کہ کسی اور کا گھر نہ اجڑ جائے، میں نے خود تنہا رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے خود سے مکمل عورت ہونے کا حق چھین لیا تا کہ تمھارے سر سے باپ کا سایہ نہ چھن جائے۔ اب کوئی اس بات کو سمجھے یا نہ سمجھے مگر میرے ضمیر پر کسی طرح کا بوجھ نہیں۔ مجھے اپنے فیصلے پر ملال بھی نہیں۔''

''کیا اُس حادثے کا بھی تمھیں ملال نہیں؟''

اپرنا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ میرا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ جس حادثے کو خود اپنے سے بھی چھپا کر رکھا تھا، آج وہی اس کے

سامنے منہ پھاڑ کے کھڑا ہو گیا.... دونوں کے درمیان جب خاموشی کا سایہ پھیلنے لگا تو اپرنا کی آواز کہیں دور سے ماضی کی وادیوں سے آتی سنائی دی:

"اس روز میں تیز بخار کی وجہ سے اچانک اسکول سے جلدی بھیج دی گئی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے لوٹ رہی تھی کہ جاتے ہی ماں کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں گی۔ کتنی دیر دروازے پر نڈھال کھڑی رہی، کئی بار دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا تو سامنے پاپا تھے۔ مجھے دیکھ کر چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور غصّے سے جھنجھلا اُٹھے.... ماں گھر پر نہیں تھی.... مجھ سے جلدی آنے کا سبب بھی نہ پوچھا، نہ میری خراب طبیعت انھیں نظر آئی۔ دو منٹ بعد ہی مجھے پیسے تھما کر بازار سے چاکلیٹ لینے کو بھیجنے لگے.... مجھے ان کا برتاؤ کچھ اٹپٹا سا لگا.... کہیں کچھ گڑ بڑ ہے، یہ میں سوچ تو رہی تھی لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پھر بیڈ روم میں اپنی چپّل تلاش کرنے لگی تو تمھیں پلنگ کے نیچے چھپا ہوا دیکھ کر میں گھبرا گئی اور دوسرے ہی پل میں سائیکل اٹھا کر گھر سے باہر مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی.... عمر ہی کیا تھی اس وقت میری؟ گیارہ یا بارہ سال! تم کہتی ہو تمھارے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو، محسوس کر سکتی ہو کہ اس کچّی عمر کی بچّی کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑا ہو گا جس نے اپنی ماں کی بجائے باپ کے بیڈ روم میں ایک غیر عورت کو چھپا ہوا دیکھا ہو گا۔ یہ منظر میری ہستی کے ساتھ جُڑ گیا۔ سوتے جاگتے میں نے اس زخم کی ٹیس محسوس کی ہے۔ تم جانتی ہو اس حادثے نے میرے پاپا کو میری نظروں سے گرا دیا، باپ بیٹی کے رشتے میں فاصلہ پیدا ہو گیا۔ میرا مرد ذات سے اعتبار ہی اٹھ گیا.... آج اس حادثے کے تیس سال بعد جب میں اپنی زندگی کی بیالیس بہاریں دیکھ چکی ہوں، اپنے شوہر اور بیٹے کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہوں.... اپنے شوہر پر آنکھ موند کر یقین کیے جانے کا سکھ میں کبھی پا ہی نہیں سکی اور تم کہتی ہو تمھارے ضمیر پر بوجھ ہی نہیں؟"

"ابھی میں نے صرف یہ اعتراف کیا ہے کہ میں نے پیار کیا، عشق کیا مگر یہ بھی اعتراف کرتی ہوں کہ میں تمھاری اور تمھاری ماں کی قصوروار ہوں.... جانے انجانے بہت دکھ دیے ہیں میں نے تمھیں.... کسی کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرنا اور کسی کا شدید پیار پانا بہت مشکل

سے نصیب ہوتا ہے....میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے پیار کے عوض میں پیار ملا مگر مجھ سے زیادہ بدنصیب بھی کوئی نہیں.....کیونکہ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے غلط آدمی سے پیار کیا....اس آدمی سے جس پر میرا کوئی حق تھا ہی نہیں مگر پیار کا مقصد صرف پانا ہی تو نہیں ہوتا....میں نے پا کر بھی اسے نہیں پایا، ساری زندگی تنہا کاٹ دی۔ بہت بڑی قیمت چکائی ہے میں نے ایک غلط قدم کی۔''

''اور میری ماں کو اپنے پتی کا پیار حق کی طرح نہیں بلکہ خیرات کی طرح ملا۔ نہ جانے کب اس رشتے کی ڈور ٹوٹ جائے، نہ جانے کب وہ گھر سے بے گھر کر دی جائے، اسی خوف کے سایے میں ڈر ڈر کر وہ جیتی رہی۔''

''یہ خوف تب تک ان کے ساتھ رہا جب تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار ایک پارٹی میں اتفاق سے ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔ بھاسکر دوستوں کے ساتھ پینے پلانے میں مصروف تھے مگر پھر بھی ان کی نظریں ہم پر ہی تھیں....موقع ملتے ہی مُکتا نے مجھے گھیر لیا اور مجھے باہر لان میں لے آئی۔ میں جانتی تھی بات کیا ہوگی پھر بھی میں ان کے ساتھ باہر آ گئی۔ انھوں نے بہت کچھ کہا اور میں سنتی رہی....پھر آخر میں جب یہ کہا کہ تم ابھی جوان ہو، تمھیں بہت سے چاہنے والے مل جائیں گے، میں اس عمر میں کہاں جاؤں گی اپنی بیٹی کو لے کر.....تم میرا گھر مت توڑو۔ اس وقت میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میں بھاسکر سے پیار کرتی ہوں مگر اس کا گھر توڑ کر اپنا گھر نہیں بسانا چاہتی.....مجھے کوئی بھی رشتہ آدھا ادھورا نہیں چاہیے۔ میں آپ کی جگہ لینے کی کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ بے فکر رہیے میں اتنی خود غرض نہیں کہ ایک پتنی سے اس کا پتی اور ایک بچّی سے اس کا باپ چھین لوں۔ آپ اپنے دل سے یہ ڈر نکال دیں۔ یقین کریں جو کہہ رہی ہوں مرتی مر جاؤں گی مگر اپنی بات سے پلٹوں گی نہیں...

''ہم دونوں کو پہلی بار موقع ملا تھا اس طرح بات کرنے کا.... پتہ ہی نہیں چلا کب بھاسکر ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے.....قہر آلود نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا....مُکتا سہم گئیں۔

جب میں نے کچھ کہنا چاہا تو میری طرف دیکھے بنا مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پارٹی چھوڑ کر نکل گئے۔''

''مجھے یاد ہے آج بھی وہ خوفناک رات۔ ماں کے رونے کی آوازیں سن کر میں سہم کر نیند سے جاگ اٹھی تھی۔ غصّے اور نشے نے پاپا کو بے قابو کر دیا تھا اور وہ خود کو جلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ماں نے رو رو کر نہ جانے کس کس طرح کیا کیا واسطے دے کر، معافی مانگ کر دوبارہ اس غلطی کو نہ دوہرانے کا وعدہ کیا تب جا کر وہ شانت ہوئے تھے.... اس رات ماں رات بھر سسکتی رہی تھی اور میں دوسری طرف منہ پھیرے انجان بن کر سوتی رہی تھی۔ صبح ماں نے میرا تکیہ گیلا دیکھا تو مجھے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا تھا۔ ان کے اَن کہے درد کی میں گواہ بھی تھی اور حصّے دار بھی۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میری ماں نے کبھی تمھیں بُرا نہیں کہا۔ میرا روم روم تمھیں بُرا اور صرف بُرا ہی کہتا رہا۔ میری زبان جب کبھی بھی تمھارے لیے زہر اُگلتی تو ماں مجھے یہ کہہ کر ٹوک دیتی: 'تم اپنی زبان گندی مت کرو.... اوپر والا سب حساب رکھتا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے۔'' اپرنا نے ایسے منہ بنایا جیسے کڑوی گولی نگل لی ہو۔

''تمھاری ماں جانتی تھی کہ بھاسکر وہ ریگستان ہے جس کی پیاس ندی نہیں ساگر ہی بجھا سکتا ہے اور مَیں تو وہ سمندر نہیں تھی..... بھاسکر کی تشنہ طبیعت سرسبز و شاداب رہتی تو گھر میں سکون اور خوشی کا ماحول بنا رہتا اور پھر اس ملاقات کے بعد میری طرف سے وہ بے فکر بھی ہو گئی تھی۔''

''ماں نے بے شک تمھیں گناہگار نہ سمجھا ہو مگر میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے چاہے کتنے ہی ثواب کے کام کر لو مگر اوپر والے کو حساب تو دینا ہی ہوگا۔''

''میں نے جانے انجانے میں جو دُکھ تم لوگوں کو دیے اس کا احساس مجھے تھا مگر اس کی چبھن، اس درد کی ٹیس اس وقت زیادہ محسوس ہوئی جب بھاسکر ایک روز اچانک ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ زندگی ان کے بغیر بھی کاٹنی ہوگی.... تمھاری ماں کے پاس تم تھیں

جینے کے لیے، میرے پاس یادوں کے سوا کچھ نہ تھا....دھیرے دھیرے یادوں کا حصار بڑھنے لگا اور ساتھ میں خالی پن میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ یہ یادیں دن رات مجھے ڈسنے لگیں اور ان میں سے بار بار ابھرتا نفرت سے بھرا تمھارا چہرہ ستانے لگا....ایک بچّی کی نفرت کے داغ دھونے کے لیے کئی بچّوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جینے کا مقصد ملا تو تیز وتند یادوں نے بادِ نسیم کی طرح دل ودماغ کو سکون دینا شروع کر دیا۔ وہ گزرے لمحوں کا کرب جو میری کمزوری بن گیا تھا اب وہ ہی میری طاقت ہے....اب نہ زندگی سے کوئی شکوہ ہے، نہ رنج نہ پشیمانی۔ پہلے تو دنیا کے رسم ورواج ہمارے دشمن تھے مگر اب میرے اور بھاسکر کے درمیان نہ دنیا، نہ دنیا داری نہ دنیا کے بندھن۔ پہلے مجھے لگتا تھا کہ میں نے انھیں پا کر بھی کچھ نہیں پایا مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ نہ پا کر بھی سب کچھ پالیا۔ پانے اور کھونے کے معنی ہی....'' بات ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ رادھے شیام نے دروازہ پر دستک دی۔

''دیدی پرارتھنا کا وقت ہو گیا۔ بچّے انتظار کر رہے ہیں۔''

اس نے دیوار پر دیکھا گھڑی ساڑھے سات بجا رہی تھی۔اس نے اپرنا کو دیکھتے ہوئے کہا:

''رادھے شیام کہہ رہا تھا کہ آپ نے کچھ رقم دینی ہے اس آشرم کو، اگر آپ اب بھی سوچنا چاہتی ہیں تو پھر کبھی سہی....آج بھاسکر کی برسی ہے اور اگر آپ پرارتھنا میں شامل ہونا چاہیں تو آسکتی ہیں۔ چلو رادھے شیام۔''

رادھے شیام چپ چاپ میرا کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور وہیل چیئر دروازے کی طرف بڑھا دی۔اپرنا اسے وہیل چیئر پر دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔

''تم وہیل چیئر پر؟ یہ سب کیا ہے؟''

''یہ شاید اوپر والے کا حساب ہے۔''

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے زرد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا....اپرنا کے قدم وہیں جم کر رہ گئے اور ایک مدت سے جمی ہوئی نفرت دھیرے دھیرے پگھلتی محسوس ہوئی۔

OO

مجھے کیا بُرا تھا مرنا

شام پانچ بجے وہ سج سنور کر پون کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس نے خاص پون کی پسند کی نیلے آسمانی رنگ کی سِلک کی ساڑی پہنی تھی۔ حالانکہ اُسے ساڑی اچھے سے باندھنی بھی نہیں آتی تھی پھر بھی اُس نے اپنی نند کی مدد سے اُسے سلیقے سے پہنا تھا۔ بال سنوار کر بنائے تھے۔ میک اپ کی اُسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ نکھری ہوئی سفید رنگت، بھرے بھرے گلابی رخسار، لال گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹ، کالی بڑی بڑی آنکھیں اور اُس پر کاجل کی لکیر، ماتھے پر سجی گول بندیا اور دونوں کلائیوں میں میچنگ نیلے آسمانی رنگ کی کانچ کی چوڑیاں۔

رَما اپنی بھابھی کی خوبصورتی اور سادگی دیکھ کر دل ہی دل میں نہال ہو رہی تھی۔ کمی تھی تو بس ایک چیز کی۔ اس کے چہرے پر جذبات کے رنگ کبھی نظر نہیں آئے۔ چہرہ ہمیشہ سپاٹ ہوتا کورے کاغذ کی طرح۔ دو موٹی موٹی کالی دلکش آنکھیں بولتی نہ تھیں صرف اِدھر اُدھر سب نہارتی تھیں۔ کبھی کبھی ان آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آتی یا پھر شاید یہ احساسِ کمتری تھا۔

صبح کام پر جاتے وقت پون نے اُس سے کہا تھا 'شام کو تیار رہنا فلم دیکھنے چلیں گے'۔

اور وہ شام ہونے سے پہلے ہی گھر کے سب کام نبٹا کر تیار ہو گئی۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے سے نہیں کٹ رہی تھیں۔ کبھی وہ کمرے میں آ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی تو کبھی ساس کے پاس جا بیٹھتی۔ شام کے سائے پھیل کر رات کے اندھیرے میں سمٹ گئے۔ آسمان پر چاند چمکنے لگا اور ستاروں کی محفل روشن ہو گئی مگر اس کا چاند نہ جانے کس بدلی میں چھپا تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ فلم شروع کیا اب تو ختم ہونے کا وقت آ گیا۔ ابھی

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اُٹھ کر کپڑے بدل لے کہ ساس نے اپنے کمرے سے آواز لگائی:

''بہو اگر کھانا تیار ہو گیا ہو تو ہمارا کھانا لگا دے۔''

''جی امّاں جی۔''

اتنا کہہ کر وہ اٹھی۔ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے سراپا کو نہارا اور سوچنے لگی ''کتنی بدل گئی ہوں میں۔ کیا فائدہ اتنا سجنے سنورنے کا، جس کے لیے اتنا ہار سنگھار کیا اُسی نے ہی نہ دیکھا۔''

بے قرار دل میں اُمڈتے سیلاب کو اُس نے رِہا کر دیا اور آنکھوں کے ذریعے گلابی رخساروں کو بھگوتے ہوئے شبنم کے قطروں نے گنگا جمنا کا رُوپ لے لیا۔ سیلاب گزر گیا اور اُسے پُرسکون کر گیا۔ دل میں چھپی ہوئی ٹیس نے سر اُٹھا کر سرگوشی کی: 'اگر تجھے اس رُوپ میں دھیرج دیکھتا تو پہچان ہی نہ پاتا۔' دوسرے ہی پل اُس نے ان خیالوں کو جھٹکا، جس رشتے نے وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہو، اُس کے بارے میں کیا سوچنا۔ وہ اُٹھی، کپڑے بدلے، نیلی آسمانی چوڑیاں اُتار کر رکھ دیں اور کام میں لگ گئی۔ جب تک پون گھر لوٹا وہ گھر کے سبھی کام نپٹا چکی تھی۔

گھر میں گھستے ہی پون نے میرا کا چہرہ پڑھنا چاہا تو پریشان ہو گیا۔ بیوی کے چہرے پر نہ کوئی گلہ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ مایوسی نہ غصّہ۔ چہرہ پُرسکون جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو شوہر کی اچھی خبر لیتی مگر وہ بالکل خاموش، معمول کی طرح اس کے لیے پانی لے کر آئی اور آتے ہی پوچھا۔

''آج کام زیادہ تھا کیا؟''

''نہیں، چھٹّی تو وقت پر ہی ہو گئی مگر راستے میں چند پرانے دوست مل گئے اور کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ گپ شپ میں ایسے مست ہوئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا اب یہ سن کر تو وہ بھڑک اُٹھے گی۔ غصّے میں لال پیلی ہو جائے گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات جیسے پُرسکون تھے ویسے ہی رہے اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ میرا چاہ کر بھی شوہر سے کوئی گلہ نہ کر سکی۔

''کھانا لگا دوں۔''

''تم نے کھالیا؟''

''ابھی نہیں۔''

''تو تم کھالو۔ میں کھا کر آیا ہوں۔'' اُس نے اپنی طرف سے ایک اور نشتر چھوڑا مگر وہ 'اچھا' کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور پون پیر پٹکتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی اُس پر اپنا حق جمائے۔ اُس سے شکایت کرے، گلہ کرے، لڑائی کرے، جھگڑا کرے۔ وہ جان بوجھ کر اسے اُکساتا، ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ اُسے غصّہ آ جائے اور جذبات کا ہر رنگ اُن کی زندگی میں کُھل جائے تاکہ رشتہ اور مضبوط ہو سکے مگر وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اس پر اگر اثر ہوتا بھی ہوگا تو بھی وہ ظاہر نہیں کرتی تھی، بس خاموش رہتی اور پون اُس کے چہرے پر سپاٹ کوراپن دیکھ کر اُکتا جاتا، سٹپٹانے لگتا جیسے کسی نے اس کی انا کو چوٹ پہنچائی ہو، وار کیا ہو، زخمی کر دیا ہو۔

چھ مہینے پہلے شادی کے بعد جب وہ چار روز کے لیے نینی تال گھومنے گئے تو پون نے ہچکچاتے ہوئے نئی نویلی دلہن سے پوچھا۔

''اگر تم اجازت دو تو میں دو پیگ لگا لوں۔ موسم بھی سہانا ہے اور پھر تم بھی ساتھ ہو تو شام اور رنگین ہو جائے گی۔''

''اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔ اگر آپ کا دل کر رہا ہے تو ضرور لے لو۔ میرے بابا تو روز شام کو پیتے تھے۔''

اس نے سوچا تھا کہ اُس کی بیوی اُسے جھٹ سے منع کر دے گی اور کہے گی:

'آپ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں تو موسم کا مزہ مل کر لیتے ہیں، کسی نشے کی کیا ضرورت ہے؟'

یہ پہلا موقع تھا جب اُسے حیرت ہوئی تھی۔ اُس نے بھی ضد میں پہلا دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا پیگ پی ڈالا۔ وہ اطمینان سے اس کے پاس بیٹھی رہی، نہ روکا نہ ٹوکا۔ اُس نے سگریٹ سلگائی اور دُھواں اُس کے چہرے پر چھوڑ دیا وہ پھر بھی خاموش رہی۔ آرام سے بیٹھ کر اپنے گاؤں کی باتیں سناتی رہی۔ اسے یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اُس کی باتیں، پون سن ہی نہیں رہا تھا، وہ اکیلے ہی بولے جا رہی تھی۔

گھوم پھر کر جب وہ گھر لوٹے تو اُس نے ماں سے ملتے ہی اکیلے میں گلہ کر دیا۔

''میں نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم پر چھوڑا تھا ماں۔''

''میں نے کیا کوئی غلط فیصلہ کیا ہے؟'' ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس بار غلط ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ کی میرا ویسی نہیں جیسی مجھے چاہیے تھی۔''

''لڑکی خوبصورت ہے، سمجھ دار ہے، بڑوں کی عزّت کرتی ہے، چھوٹوں سے پیار کرتی ہے، اور کیا چاہیے تجھے؟''

''سب ٹھیک ہے مگر مجھے جیتی جاگتی جذبات اور احساسات سے پُر عورت چاہیے، کوئی موم کی گڑیا نہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور ماں اُس کی بات سمجھنے میں اُلجھ گئی۔

وہ ہمّت نہیں ہارا۔ شاید نئی نویلی دلہن شرماتی ہوگی، گھبراتی ہوگی۔ شاید وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے۔ ہوسکتا ہے وہ ایک الگ ماحول سے آئی ہے اسی لیے ہر بات کا فرق ہے۔ اسے شہر کی لڑکیوں کی طرح، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ ایک جنگلی پھول کی مانند تھی جو قدرت کے صاف شفاف ماحول اور حسین وادیوں میں پروان چڑھی اور اپنی مہک سے اپنے اِرد گرد کو متاثر کیا۔ اس پھول کو ایک گلدان میں لگا کر سجا دیا گیا تو پھول کا کیا قصور۔ دھیرے دھیرے وہ پھول شہر کی آلودہ فضا میں مرجھانے لگا اور اپنی مہک کھونے لگا۔

پون نے کئی پینترے آزمائے کہ وہ اُس کی کسوٹی پر کھری اُترے مگر ہر بار ناکام ہی رہا۔ سال بھر میں وہ جان گیا کہ اُس کی بیوی ایک خوبصورت گڑیا سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ چہرہ خوبصورت، دل صاف مگر بے سلیقہ۔ وہ اسے اپنے ساتھ دعوتوں، محفلوں، ہوٹلوں میں لے جانے سے کترانے لگا اور میرا نے بھی گھر کی چار دیواری قبول کر لی۔ ساس اور نند کی جی توڑ محنت کا اثر اتنا ہوا کہ بظاہر تو اس میں تبدیلی آ گئی، ڈھنگ کے کپڑے پہننے کا سلیقہ آ گیا

مگر شہر کی موڈرن لڑکیوں کے طور طریقے نہ سیکھ سکی۔ گھر گرہستی کا سارا بوجھ اس نے اپنے ذمّے لے لیا۔ گھر کے ہر فرد کی ضرورتوں کا خیال رکھتی۔ ساس کو زمین پر پیر نہیں رکھنے دیتی تھی۔ کبھی اُس نے زبان نہیں چلائی، ماتھے پر کسی نے شکن نہیں دیکھی، پھر اس بہو سے کوئی خوش کیوں نہ ہوتا مگر جب بھی ماں بہو کی تعریف کرتی تو وہ جل کر رہ جاتا اور کڑواہٹ بھرے لہجے میں کچھ نہ کچھ کہہ ڈالتا:

''آپ کو اچھی بہو ملی آپ خوش رہو۔ مجھے تو بیوی چاہیے تھی خادمہ نہیں۔ نصیب اپنا اپنا۔''

بیٹے کی باتوں میں چھپی مایوسی اور طنز ماں کو بے چین اور پریشان کر دیتا۔ کچھ لوگ وقت اور ماحول کے ساتھ خود بخود بدل جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو لاکھ کوششوں کے باوجود ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ میرا بھی اُن میں سے ایک تھی۔ گھر پر سب کو خوش رکھنے کے فراق میں اُس نے اپنی ہستی کو ہی بھلا دیا۔ جس شوہر کو دن کے اُجالے میں اس میں سینکڑوں عیب نظر آتے تھے وہی رات کی تنہائی میں سب دُوریاں مٹا کر اپنی پیاس بجھانے اُسی کنوئیں پر جاتا۔ مگر کنوئیں نے کبھی حقارت کا جواب نفرت سے نہیں دیا۔ پیاس مٹتے ہی اُسے چھپے ہوئے عیب پھر نظر آنے لگتے۔ سب کی نظروں میں وہ بے چاری بن کر رہ گئی۔ شوہر کی اتنی خدمت کے باوجود اُس کی محبت حاصل نہ ہو سکی۔

بے چاری کا خطاب اُسے شادی کے بعد ملا تھا۔ ماں تو اُسے پیار سے نصیبو کہا کرتی تھی۔ پہاڑوں کے پیچھے ایک چھوٹے سے گاؤں چوپال میں اس کا جنم ہوا۔ باپ کے سیب اور چیری کے باغ تھے۔ میرا کے پیدا ہوتے ہی ایک عرصے سے اٹکا زمین کا جھگڑا سلجھ گیا اور کھوئی ہوئی زمین حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ وہ اُسے پیار سے لکشمی بھی کہتا تھا۔ اُس کا ماننا تھا کہ بیٹی کے قدم پڑتے ہی گھر میں خوشحالی آ گئی۔ پھر جب اس کے بعد ایک کے بعد ایک دو لڑکوں نے جنم لیا تو ماں نے اُسے نصیب والی کا خطاب دے دیا۔ جب اُسے بیٹی پر زیادہ لاڈ آتا تو اُسے 'نصیبو' کہہ کر پکارتی۔ جس سال سیب اور چیری کی فصل اچھی ہوتی گھر میں لہر بہر ہو جاتی اور جس سال موسم کا یا قدرت کا قہر برپا ہوتا، ماں گھر گرہستی کا خرچ سوچ کر بڑے سلیقے سے کرتی۔ اُس کی کوشش ہوتی کہ کہیں بھی بچوں کو کسی چیز کی کمی نہ

ہو، پھر بھی تنگ دستی کی حالت خود بخود عیاں ہو جاتی۔ باپ کے چہرے کی رونق، اُن کے جاندار قہقہے، ان کی بھری جیب کا اعلان کر دیتے اور اگر شام ڈھلے وہ شراب کے نشے میں چور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں قدم رکھتے اور ماں کے کوسنے شروع ہو جاتے تو اُنھیں خبر ہو جاتی کہ باپ کی جیب خالی ہے۔ ماں کو اُن کے شراب پینے پر اعتراض نہیں تھا یہ تو گاؤں کے مردوں کا ایک اہم شغل تھا۔ شام ڈھلے کبھی تیکھی سردی سے بچنے کو، کبھی میٹھی سردی کا مزہ لینے کے لیے اس کا سہارا لیتے۔ ماں کہتی شراب پینی ہے تو حساب سے پیو اور گھر بیٹھ کر پیو کیونکہ رات کے اندھیرے میں سڑکوں اور کھائی میں گرنے اور آوارہ کتّوں سے منہ چٹوانے سے تو یہ بہتر ہے۔ ماں لڑتی جھگڑتی رہی مگر اُس کا باپ اپنی من مانی کرتا رہا۔

پون نے یہ عادت بنالی تھی کہ دفتر سے وہ دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر رات کو ہی لوٹتا اور اکثر شراب کے نشے میں چور۔ شادی سے پہلے تو وہ صرف خاص موقعوں پر ہی شراب کو ہاتھ لگاتا تھا۔ شادی کے بعد دھیرے دھیرے یہ اُس کی عادت بن گئی۔ بیوہ ماں نے اُسے جب بھی سمجھانا چاہا تو بیٹے نے ماں کے سر ہی الزام دھر مارا۔ اُس نے کون سا اپنے بیٹے یا اپنے خاندان کا بُرا چاہا تھا، وہ تو اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شامل ہونے گئی تو اُس کی نظر اس تازہ کھلی کلی پر ٹھہر گئی جو بھیڑ میں سب سے الگ لگ رہی تھی۔ اُس لڑکی کی سادگی، اس کا ٹھہراؤ اُس کی خوبصورتی اُسے پسند آئی۔ وہ جتنے دن وہاں رہی اُس کی نظریں اُس لڑکی کو تولتی ٹٹولتی رہیں۔ پھر اُس نے اُس ہیرے کو اپنی تجوری میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹے نے سب فیصلہ ماں پر چھوڑ دیا تھا اور جب اُس نے میرا کے ماں باپ سے اُس کا ہاتھ مانگا تو وہ چونک اُٹھے۔ باپ اتنی دُور بیٹی بیاہنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کو ڈر تھا کہ بیٹی شہر کے طور طریقے اور بڑے گھروں کے رہن سہن سے ناواقف ہے۔ جب اُس نے اپنے دل میں اُٹھنے والے اندیشے ظاہر کیے تو پون کی ماں نے بات ہنس کے ٹال دی۔

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے، خود کو بدل لے گی، ہم کون سا اس شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں بھی تو چھوٹی جگہ سے آئی ہوں مگر حالات کے ساتھ خود کو بدلا ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یہ سب آپ بے فکر ہو کر مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کی بیٹی راج کرے گی راج۔"

کسی نے میرا سے اُس کی مرضی نہیں پوچھی اور چار دِنوں میں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔اب بے چاری کیسے بتائے ماں باپ کو کہ وہ گھر کی رانی تو ہے، گھر کا ہر کام اُس کی مرضی سے ہوتا ہے مگر اس کا راجا اُس سے دُور دُور رہتا ہے۔صرف قریب اپنی ضرورت پوری کرنے ہی آتا ہے۔

جب میرا بہو، بیوی سے ماں بنی تو اُس کے دل میں ایک اُمید نے جنم لیا کہ شاید یہ کڑی اُن دونوں کے بیچ کی دُوریاں مٹا دے۔رشتے تو مضبوط نہ ہو سکے پر اتنا ضرور ہوا کہ پون کو یہ بندھن توڑنے کا ارادہ ترک کر دینا پڑا۔اس نے بھی حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور اس رشتے کو اپنی لاڈلی کی خاطر قبول کرلیا۔میرا نے بچّی کو جنم دینے کا سکھ تو حاصل کرلیا پر بیٹی کے نام سے لے کر اُس کی پرورش کے ہر اہم فیصلے پر اُس کا کوئی حق نہ تھا۔پون نے اُس کا نام نینا رکھا اور اُس نے یہ طے کرلیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت نینا کو ہی دے گا۔ ہر بچہ گھر سے اور خاص طور سے اپنی ماں سے زندگی کے طور طریقے سیکھتا ہے۔کہیں بیٹی بھی ماں جیسی ہی نہ بن جائے ،اس ڈر سے اُس نے یہ فیصلہ کیا۔زمانے کے طور طریقے سکھانے کے لیے اُس نے شہر کے سب سے اچھے اسکول میں نینا کا داخلہ کروایا۔اُس وقت اُسے یہ احساس نہیں ہوا کہ ماں بیٹی کے بیچ فاصلہ بڑھ جائے گا۔جس گھر میں عورت کی عزّت اُس کا مرد نہیں کرتا وہاں اس کی عزّت اُس کی اولاد بھی نہیں کرتی۔ نینا نے جب ہوش سنبھالا تو اُسے اپنی دوستوں کی پڑھی لکھی موڈرن ماؤں سے مل کر بہت مایوسی ہوتی۔ مایوسی سے زیادہ کمتری کا احساس اتنا بڑھ گیا کہ اُسے اپنی سہیلیوں کو اپنے گھر بلانے میں شرم محسوس ہونے لگی۔ ماں اگر کبھی اُسے کسی بات پر ڈانٹ دیتی تو باپ بیٹی کے سامنے ہی میرا کو ڈپٹ دیتا۔اور اگر وہ خود نہ ڈانٹ کر پون کو بیٹی کی گستاخیوں سے آگاہ کرانا چاہتی تو اُسے اُلٹے چار باتیں سننا پڑتیں۔اُن دونوں کے لیے اس کا وجود صرف اس قدر تھا کہ وہ ان کے ہر کام آرام سے کر کے دیتی تھی۔

ساس کے گزر جانے اور نند کی شادی کے بعد وہ اپنے ہی گھر میں بالکل تنہا ہوگئی۔ اتنے سالوں میں وہ صرف دو بار ہی میکے گئی، ایک شادی کے بعد اور دوسرے جب

نینا چار سال کی تھی۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ سوچتی میکے جائے گی مگر نینا جانے کو تیّار ہی نہ ہوتی۔

''اتنی بور جگہ ہے، مجھے اپنی چھٹّیاں خراب نہیں کرنی۔ آپ اکیلے چلے جاؤ میں پاپا کے پاس رہ لوں گی۔''

بچّی کو اکیلی چھوڑ کر وہ کیسے جاتی۔ دھیرے دھیرے میکے والوں سے صرف فون ہی رابطے کا ذریعہ رہ گیا۔

گھر کی چار دیواری اور اُس کے اندر پھیلتا سُونا پن اُسے دیمک کی طرح چاٹنے لگا اور وہ ڈِپریشن کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ایک روز وہ اس قدر ٹوٹی کہ بستر ہی پکڑ لیا۔ شادی کے سولہ سال وہ اپنے شوہر اور اس گھر کی خدمت میں اتنی مصروف رہی کہ اُس نے انھیں ہی اپنی دُنیا بنالیا اور آج جب وہ خود بستر پر لگ گئی تو باپ بیٹی کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ ان دونوں نے تو کبھی خود کے لیے بھی پانی کا گلاس نہ اُٹھایا تھا تو وہ اس کی تیمارداری کیسے کرتے۔ مجبوراً اُس کے میکے والوں کو فون کیا گیا اور وہ سنتے ہی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹرں کا بھی مشورہ تھا کہ آب و ہوا کا بدلاؤ اُس کے لیے ضروری ہے پھر چوپال سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک مدّت بعد وہ اپنے گھر لوٹی تھی۔ وہی اونچے اونچے پہاڑ، وہی چیل اور دیودار کے درخت، وہی دوپہر کی میٹھی میٹھی دُھوپ، وہی شام کی چلچلاتی ٹھنڈی ہوا، وہی تازہ فضا، وہی کھلا آسمان اور وہی سیدھے سادے لوگ۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا مگر وہ اس زمین سے کیا بچھڑی، وہ تو خود سے بھی جدا ہوگئی۔ پرانے سنگھی ساتھی کچھ تو وہیں تھے اور باقی اس کی طرح بہترین زندگی کی خواہش میں اپنی جڑوں سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا پھر اُسے کون یاد رکھتا۔ ایک ساتھی باقی بچی تھی۔ وہ جب بھی آتی ماضی کے جھروکوں کی کھڑکی کا پٹ دھڑ سے کھول دیتی۔

بچپن اور جوانی کی کھٹّی میٹھی باتیں تنہائی میں چپکے سے آکر اُسے اُداس کر جاتی تھیں، جس نے قسم کھائی تھی کہ میرا کے کبھی روبرو نہ ہوگا اگر اتفاقاً کہیں مل بھی جائے تو اجنبی بن کر راستہ بدل لے گا، وہ بھی اس کی بیماری کی خبر سن کر سب گلے شکوے بھول کر اُس سے ملنے

چلا آیا۔ دھیرج وہیں سرکاری اسکول میں پڑھاتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا کو چاہتا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ کھیل کود کر، لڑ جھگڑ کر ہنستے روتے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنے جذبات کو لفظوں میں ظاہر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور میرا اَن کہی خواہشوں کو سمجھ نہ سکی۔ میرا کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ نے اُسے توڑ دیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ دل کی بات دل میں ہی دَب کر رہ گئی۔ سب سے اپنا پیار چھپا کر وہ زندگی میں بڑھتا گیا۔ ماں باپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کی شادی کی تجویز ٹالتا رہا۔ بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا کہ میرا کی آمد اور اُس کی ناسازیِ طبیعت نے ایک بار پھر سوئے ہوئے خوابوں کی ٹیس سے آشنا کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر، اُس سے مل کر وہ کھل اُٹھے گی، خوشی سے اُچھل پڑے گی۔ پھر وہ دونوں مل کر گزرے دنوں کی باتیں یاد کر کے بچپن میں لوٹ جائیں گے۔ مگر اُسے دیکھ مل کر اُسے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرا کے زرد چہرے پر نہ ہی مسکراہٹ آئی اور نہ ہی ویران اُداس آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی۔ اُس کے روم روم سے یاس، نا اُمیدی، ٹیس، ٹوٹے خوابوں کی کسک اور زخمی جذبات چھپائے سے بھی نہیں چھپ رہے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ جلد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے بوجھل من سے وہاں سے چلا آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ خود کو کوستا رہا کہ وہ اتنے سال دل میں رنجش کیوں پال کر بیٹھا تھا۔ وہ بے چاری تو خود سے لڑائی لڑتے لڑتے بکھر گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی۔

دھیرج کا بس چلتا تو میرا کے پاس سے ہی نہ اُٹھتا مگر لوک لاج کے مارے دوسرے تیسرے دن میرا سے ملنے آجاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اُسے باتوں میں ایسے بہلائے کہ وہ اپنے دل پر پڑے غبار کو اُتار پھینکے۔ ماں باپ، دونوں بھائی اُس کے آگے پیچھے گھومتے مگر اکیلے پن کا احساس اُس کے اندر سے کم نہیں ہو رہا تھا۔ سب کے ہوتے ہوئے وہ خود کو تنہا سمجھتی۔ دھیرج کو اپنے لیے پریشان دیکھتی تو اَن دیکھے خواب چپکے سے اُس کی آنکھوں میں لوٹ آتے اور بیتے دنوں کو ڈھونڈنے لگتے۔ دل ہی دل میں اُسے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ جن کے لیے خود کو بھلا دیا وہ میرے اپنے ہیں اور وہ ہی اپنے اُسے بھلائے بیٹھے ہیں۔

اُن کے لیے وہ رات رات بھر جاگی تھی۔ ہمیشہ ان کی سلامتی کی دُعائیں مانگتی، انھیں دیکھ کر وہ جیتی رہی اور اُنھی اپنوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تیمارداری تو دُور کبھی خبر تک نہ لی۔ اُس کا حال جاننے کی زحمت تک نہ کی۔ ہر صبح وہ ایک آس لیے اُٹھتی کہ شاید آج فون آجائے۔ شاید بیٹی کو اُس کی یاد آجائے یا شاید پون بھولے سے اُسے یاد کرلے اور دن ڈھلتے ہی مایوسی کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا اور دھیرے دھیرے وہ ان اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ زبان نے چُپ اختیار کر لی اور لبوں سے ہنسی چُرالی۔ مسکراہٹ نہ جانے کن خلاؤں میں گم ہوگئی اور کڑواہٹ نے وجود کو جلانا شروع کر دیا۔ بھوک ختم ہوگئی تو جسم بے جان تھکا تھکا نڈھال سا رہنے لگا۔ اپنوں کی بے رُخی، بے قدری، بے نیازی کا گھن لگ گیا جو اُسے اندر ہی اندر دن بہ دن کھوکھلا کیے جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی اُن کا کہنا تھا کہ:

'ہم علاج کر سکتے ہیں مگر مریض کے اندر جینے کی خواہش کو زندہ نہیں کر سکتے۔ یہ سب تو آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں'۔

بیٹی کی بگڑتی حالت دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ بیٹی سے چھپ چھپ کر آنسو بہاتے اور کوشش کرتے کہ اُس کے اِردگرد کا ماحول خوشگوار ہو۔ پون کو اُس کی گرتی حالت سے آگاہ کرنا چاہا تو میرا نے اپنی قسم دے کر منع کر دیا:

''بابا میں دیکھنا چاہتی ہوں کب تک اُن کو میری یاد نہیں آتی۔ یاد نہ بھی آئے تو کیا میری کبھی ضرورت بھی نہ پڑے گی؟''

''بیٹی یہ آزمائش چھوڑ دے۔ کبھی کبھی ان آزمائشوں میں رشتے کھو جاتے ہیں۔''

''بچا ہی کیا ہے بابا۔ دیکھنا چاہتی ہوں میں نے اتنے سالوں میں کیا کمایا۔''

''یہ ضد چھوڑ دے بیٹی۔ اپنی قسم واپس لے لے۔''

''یہ ضد نہیں ہے بابا۔ ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ بس اور کچھ بھی نہیں۔'' انھیں مجبوراً اُس کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔

ادھر کچھ دن تو پون خوشی خوشی گھر کی دیکھ بھال کی ذمّے داری نبھاتا رہا۔ صبح سے شام تک گھر سنبھالنے والی، کھانا پکانے والی آرام سے مل گئی اور خود وہ آزاد پرندے کی طرح بے فکر

ہو گیا۔ گھر پر موجود جوان ہوتی بیٹی کو بھی جب آزادی راس آنے لگی تو اُسے یہ آزادی کھٹکنے لگی۔ نوکرانی کے ہاتھ کے بنے کھانے میں وہ ذائقہ نہ تھا جو میرا کے کھانے میں ملتا تھا۔ بیٹی کی ذمّے داری کا بوجھ بڑھنے لگا تو اُسے میرا کی غیر موجودگی کھلنے لگی۔ میرا کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ اُس کی زندگی کی ہر فکر ہر ذمّے داری ہر غم میرا نے اپنے سر لے رکھے تھے۔ پھر بھی کبھی اُس نے اُف تک نہ کی۔ نہ کبھی اس نے روکھے برتاؤ کا شکوہ کیا نہ محرومیوں کا کوئی گلہ کیا، نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کسی بات کی شکایت۔ وہ سوچتا تھا روٹی کپڑا دے کر وہ اس کی سبھی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔

اب اُسے احساس ہوا کہ وہ بھی کچھ خواہشیں، کچھ ارمان کچھ تمنّائیں، آرزوئیں کچھ خواب لے کر اس گھر میں آئی ہوگی۔ اُس نے بھی اپنے جیون ساتھی کو لے کر کچھ سپنے سجائے ہوں گے جو ریزہ ریزہ بکھر گئے ہوں گے۔ وہ پھر بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہی، چاہے وہ ذاتی ہوں، گھریلو ہوں یا پھر جسمانی۔ وہ تو صرف اپنے ٹوٹے ارمانوں کو لے کر روتا رہا۔ اپنے سے باہر ہی نہیں نکلا اور نہ میرا کی قربانی، اُس کا پیار، اس کی سچائی کو سمجھ سکا۔ اس نے تو ماں بیٹی کے رشتے کو بھی پنپنے نہیں دیا۔ نہ خود اس کی عزّت کی اور نہ ہی بیٹی کو ماں کو نظر انداز کرنے کے لیے ڈانٹا بلکہ اسے ہوا دیتا رہا۔ اپنی ہی نظروں میں وہ مجرم بن گیا اور جیسے جیسے احساسِ گناہ بڑھتا گیا میرا سے ملنے کی تڑپ بھی بڑھتی گئی۔ ان تین مہینوں میں اُس نے ایک بار بھی اپنی بیوی سے بات نہیں کی تھی۔ بس رسماً گھر والوں سے ایک دو مرتبہ حال دریافت کر لیا۔ اب وہ اس کے پاس جائے تو کس منہ سے جائے۔ اداسی کے بادل بڑھنے لگے تو دل میں مایوسی چھانے لگی۔ مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ اس کیفیت سے نجات پالے مگر انا بیچ میں آ جاتی۔ راستہ سامنے تھا، منزل دکھائی دے رہی تھی پر قدم اس قدر بوجھل ہو گئے کہ اٹھائے سے بھی نہیں اٹھ رہے تھے۔ نینا کو لے کر بھی وہ پریشان تھا۔ اب اسے لگتا تھا کہ اس نے بیٹی کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی ہے۔ یہ عمر تو ناسمجھ ہے، اس عمر میں اکثر پیر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ آج تک وہ میرا کی باتیں اَن سنی کرتا رہا مگر اب وقت آ گیا ہے کہ وہ تھوڑی سختی برتے اور اسے زندگی کی اونچ نیچ سے آگاہ کرے۔ یہ کام تو ماں کا ہے اور

ماں کے ہوتے ہوئے بھی یہ فرض باپ کو نبھانا پڑے کتنے افسوس کی بات ہے۔ ایسی ہی الجھنوں میں وہ مبتلا رہنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر یار دوستوں کے لیے وہ رحم کا مرکز بن گیا۔ دفتر کے فرائض بھی وہ اچھے سے نہیں نبھا پا رہا تھا۔ ایک روز طبیعت کچھ ناسازسی محسوس ہوئی تو وہ جلدی چھٹّی کر کے گھر آ گیا۔ گاڑی ابھی پارک ہی کی تھی کہ کانوں میں زور زور سے میوزک کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اسی کے گھر سے آ رہی تھیں۔ اس نے قدم اندر رکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نینا اپنے چند دوستوں کے ساتھ جن میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی، رقص کرنے میں اتنی مشغول تھی کہ اسے اپنے بکھرتے جسم کا بھی ہوش نہ تھا۔ انھیں اُس کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا۔ وہ خاموش کھڑا پہلے دیکھتا رہا پھر غصّے سے بڑھ کر میوزک بند کر دیا۔ سب کے تھرکتے جسم ایک دم رُک گئے۔ نینا نے دیکھا اور لپک کر اُس کی طرف بڑھی۔

''پاپا آپ جلدی آ گئے؟ آیئے میں آپ کو اپنے دوستوں سے ملواتی ہوں۔''

اُن کے چہرے کے تاثرات اور غصّے کو نظر انداز کیے وہ ان سب سے ملانے لگی۔

''نینا، تم سب کو دروازے تک چھوڑ کر ابھی اسی وقت میرے کمرے میں آ ؤ ضروری کام ہے۔''

''مگر پاپا...''

بنا کچھ کہے سنے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس سے پہلے نینا نے اپنے پاپا کو اس طرح پریشان اور غصّے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی جلد ہی سب کو رخصت کر کے اس کے پاس چلی آئی۔

''تم اپنا بیگ پیک کر لو کل صبح نکل رہے ہیں۔''

''کہاں کے لیے؟''

''چوپال، تمھاری ماں کو لینے جانا ہے۔ ابھی وقت زیادہ ہو چکا ہے، سفر لمبا ہے اس لیے صبح سویرے ہی نکلنا ہے۔''

اس سے زیادہ کچھ پوچھنے کی اس کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

پشیمانی کے باعث اسے کسی پہلو چین وقرار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ صبح کے انتظار میں وہ

کروٹیں بدلتا رہا اور ماضی کے اوراق آنکھوں میں پلٹتے رہے۔ نہ جانے رات کے کس پہر آنکھ لگی تھی کہ دروازے پر زور زور کی دستک سے وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے میرا کھڑی تھی۔

''تم اس وقت؟ ساتھ کون آیا ہے؟'' اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو سڑک بالکل ویران سنسان تھی۔ سردی کی وجہ سے باہر دھند بھی چھائی ہوئی تھی اور گلی کے کتے بھی کہیں دُبکے ہوئے تھے۔

''آپ تو بھول ہی گئے مجھے؟'' گلہ کرتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوگئی۔ پہلی بار اس نے گلہ کیا۔

''تمھاری طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' اس نے میرا کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ ابھی بھی زرد ہے۔ آنکھیں تھکی تھکی اداس۔

''تم آئی کیسے ہو۔ ساتھ کوئی نہیں آیا؟'' اس نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''کمال کرتے ہو، اپنے گھر آئی ہوں۔ کسی کے ساتھ کی کیا ضرورت۔'' وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی اور پون بھی اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔'' وہ اس کے ہاتھ رگڑ کر گرمی پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔

''رہنے دو، ٹھیک ہو جائیں گے۔ کیسے ہو آپ؟''

''سوچا نہ تھا کہ تمھارے بنا زندگی عذاب بن جائے گی۔ اچھا کیا جو تم لوٹ آئیں۔ اب اپنا گھر سنبھالو۔''

''تم نے تو کبھی بھولے سے بھی یاد نہ کیا۔''

''میری شرمندگی مجھے تمھارے پاس آنے سے روکتی رہی۔ یقین مانو کل صبح چلنے والے تھے تمھیں لینے۔ دیکھو سامان تیار پڑا ہے۔'' اس نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرادی۔

''نینا کیسی ہے؟ سو رہی ہے کیا؟''

''بہت ضرورت ہے اسے تمھاری۔ اب تم آ گئی ہو تو مجھے فکر کوئی نہیں۔''

''بہت تھک گئی ہوں۔ نینا کے پاس جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور نینا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''نینا کو اٹھا لو۔''

''نہیں نہیں سونے دو اُسے۔ میں بھی اس کے ساتھ سو جاتی ہوں۔'' وہ بھی اُس کے ساتھ نینا کے کمرے میں آ گیا۔ نینا آرام سے سو رہی تھی۔ میرا نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جھک کر اُس کا ماتھا چوما اور اس کے ساتھ اُس کی رضائی میں ہی گھس گئی۔

پون نے 'گڈ نائٹ' کہتے ہوئے بتّی بجھا دی اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر اُس نے چین کی سانس لی۔

میرا کے لوٹ آنے سے دل پر پڑے بوجھ سے راحت ملی تھی۔

ابھی نیند کا جھونکا آیا بھی نہ تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اُس نے بتّی جلا کر دیکھا رات کے تین بج رہے تھے۔

''ہیلو۔''

''پون بیٹا، میں بابا بول رہا ہوں۔''

'' کیسے ہیں آپ؟''

''اگر ہو سکے تو صبح یہاں چلے آؤ۔ اس بدنصیب کو کاندھا دینے۔'' ڈوبی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''آدھا گھنٹہ پہلے وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔ بہت انتظار کیا اُس نے تمھارا۔''

یہ سنتے ہی فون اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔ وہ نینا کے کمرے کی طرف لپکا۔ نینا اکیلی بستر پر معصوم بچّے کی طرح نیند میں مسکرا رہی تھی جیسے ابھی ابھی ماں نے پیار سے سہلا کر لوری دے کر سلایا ہو۔

چادر کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی کوئی وہاں سے اٹھا ہے۔

OO

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

دلیپ سنگھ ٹھیکے دار کو گھر کے دروازے تک چھوڑ کر وہ جلد ہی اپنے بیمار باپ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر فکر کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ اپنے چہرے کے تاثر کو ٹھیک کیا کہ کہیں باپو جی اس کے چہرے کو پڑھ نہ لیں۔ وہ جیسے ہی ان کے بستر کے پاس بچھی کرسی پر بیٹھا، انھوں نے بنا آنکھیں کھولے ہی پوچھ لیا:

''چلا گیا وہ دلال؟''

وہ خاموش رہا۔

''دیکھنا تھوڑی دیر میں رنبیر بھی آ جائے گا۔ پھر وہی رام کہانی شروع کر دے گا۔''

''آپ زیادہ مت بولیے نہیں تو پھر سے کھانسی شروع ہو جائے گی۔ آپ بس آرام کریں رنبیر سے میں نپٹ لوں گا۔''

چھوٹے بچّے کی طرح ان کی چھاتی سہلاتے ہوئے اس نے انھیں آرام سے لٹا دیا۔ پچھلے کئی دنوں سے ان کی طبیعت ناساز تھی۔ ایک تو ڈھلتی عمر، دوسرے کمزور جسم کو بیماریوں نے آن گھیرا تھا۔ شدید سرد ہواؤں نے بوڑھی ہڈّیوں اور چھاتی میں اپنا ڈیرا ڈال لیا تھا جس کی وجہ سے سانس اُکھڑنے لگا تھا جس نے دھیرے دھیرے دمہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دلیپ سنگھ نے فرماں بردار بیٹے کی طرح ان کی خدمت کا ذمّہ اپنے سر لے لیا تھا۔ نہ تو اپنے جوان بیٹے رنبیر کو اور نہ ہی گھر کے پرانے خادم پورن کو اس ذمّے داری کا حصہ بنایا۔ ان کے سبھی کام وہ خود ہی کرتا۔ رات کو بھی وہ خود ہی ان کے کمرے میں سوتا۔ باپو جی کے ذرا سے

کھانسنے یا کراہنے پر بھی وہ اٹھ بیٹھتا یہاں تک کہ اگر وہ کروٹ بھی بدلتے تو بھی اسے علم ہو جاتا۔ اِن ہیلر (inhaler) ان کے تکیے کے نیچے رکھا رہتا۔ اگر ان کا سانس اکھڑنے لگتا تو وہ جھٹ سے اسے نکال کر استعمال کر لیتے۔

باپو جی کو آرام سے سوتا دیکھ وہ بھی اطمینان سے پاس رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ غور سے اپنے باپو جی کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ وقت کیسے بدل گیا ہے۔ آج جو یہ بیمار کمزور بزرگ میرے سامنے لیٹا ہے کبھی کتنا گبرو جوان ہوا کرتا تھا۔ چھ فٹ لمبا قد چوڑی چھاتی، سڈول جسم، دُور دُور تک امر سنگھ کی جوانی کے چرچے ہوا کرتے تھے۔ ننھا سا دلیپ اپنے باپو کی انگلی پکڑ کر بڑی شان سے کھیتوں میں جاتا تو کبھی ان کے مضبوط کاندھوں پر سوار ہو کر گاؤں گھومنے جاتا۔ باپو کا جسم کڑی گرمی اور سخت سردی میں کھیتوں میں محنت کر کے فولادی بن گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے باپو سے مستی میں پنجہ لڑاتے ہوئے کہتا:

''مجھے بھی آپ جیسا ہی بننا ہے۔''

''اچھی خوراک کھائے گا پیئے گا، خوب محنت کرے گا تو میرے جیسا ہی بنے گا۔''

اسے آج بھی یاد ہے کہ اس کا باپو تاروں کی چھاؤں میں ہی بستر چھوڑ دیتا تھا۔ پہلے گھر میں بندھے ڈنگروں کے کاموں سے نپٹتا بعد میں کھیتوں پر چلا جاتا۔ بے بے بھی اُٹھ کر گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ انھیں بس ایک شکایت ہمیشہ ہی رہتی کہ 'مجھ سے زیادہ تمھیں اپنی زمین، اپنے کھیت عزیز ہیں'۔ باپو ہنس کر جواب دیتے: 'جاٹ کی پہچان اس کی زمین ہوتی ہے اور تو اسے اپنی سوتن سمجھ کر جلتی نہ رہا کر'۔

اور وہ چپ چاپ ان دونوں کی پیار بھری نوک جھونک سن کر خوب مزا لیتا۔ اس کی مند مند مسکان دیکھ کر باپو کہتے:

'تو کیا مسکرا رہا ہے۔ کل کو تو بھی یہ باتیں سنے گا اپنی گھر والی سے'۔ اور گھر والی کے نام سے وہ شرما جاتا تو دونوں اس کے چہرے کی لالی دیکھ کر ہنس پڑتے۔

گاؤں کے سرکاری اسکول میں پڑھنے کے بعد جب باپو نے اس کا داخلہ ایگریکلچرل

یونیورسٹی میں دلوایا تو وہ بہت خوش تھے اور جب وہ پہلے دن کالج جانے لگا تو انھوں نے ایک وعدہ بھی اس سے لے لیا:

'دیکھ پُتّر تو آج شہر پڑھنے ضرور جا رہا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ شہر کا ہی ہو جائے گا۔ عموماً بچے شہر جاتے ہیں تو اپنی مٹی کو بھول جاتے ہیں پھر بوڑھے ماں باپ گاؤں میں بچوں کے لوٹنے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ تجھے شہر پڑھنے بھیجنا میرا ایک مقصد ہے'۔

'میں جانتا ہوں باپو'۔

'بس پھر تو یہ بات اپنے پلّے باندھ لے کہ تو اپنی پڑھائی کو اپنی زمین کی بہتری کے لیے استعمال کرے گا اور پورے گاؤں والوں کو اس کا فائدہ ہونا چاہیے'۔

وعدے کے مطابق وہ پڑھائی مکمل کر کے گاؤں میں ہی آن بسا تھا۔ اس نے جدید سائنسی تکنیک استعمال کی جس سے زمین بھی خوب زرخیز ہو گئی۔ اس کی پڑھائی اور تجربے کا فائدہ گاؤں والوں نے بھی اٹھایا۔ چھوٹے کسان سے لے کر بڑے زمیندار تک اس کی صلاح لیتے۔ زندگی بڑے آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ رنبیر بھی باپ اور دادا کی صحبت میں جوان ہو رہا تھا۔ دادا پوتے کی جوڑی خوب تھی۔ دلیپ اکثر اپنے باپو سے اس کے بیجا دُلار کی وجہ سے ناراض ہو جاتا کہ: 'آپ اس کی ہر جائز ناجائز فرمائش پوری کرتے رہے تو ایک دن ہمارے ہی سر پر چڑھ کر ناچے گا'۔

'ایک ہی پوتا ہے میرا۔ اس کی مانگیں پوری نہ کروں تو کس کی کروں۔ تو فکر کیوں کرتا ہے۔ یہ میرا شیر پُتّر ہے مجھ سے باہر نہیں'۔

دیکھتے ہی دیکھتے رنبیر بھی اپنے دادا کی طرح چھ فٹ کا گبرو جوان ہو گیا۔ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو دلیپ سنگھ کو اپنی عمر ڈھلنے کا احساس ہوا۔ باپو نے پیری کو قبول کرتے ہوئے اپنے کندھوں سے کھیتوں، منڈی اور کاروبار کا بوجھ بیٹے پر ڈال دیا۔ رنبیر نے پہلے ہی ہاتھ کھڑے کر دِیے تھے کہ زمین داری کا کام اس کے بس کا نہیں۔

امر سنگھ اور رنبیر کے بیچ عمر کا فاصلہ ضرور تھا مگر دونوں کا رشتہ صرف دادا پوتے کا نہیں بلکہ کبھی کبھی بھائی، کبھی دوست اور کبھی راہ نما کا نظر آتا۔ جو بات رنبیر اپنے باپ سے نہیں کر پاتا تھا وہ کھل کر امر سنگھ سے کر لیتا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ دونوں کسی بات پر کھُسر پھُسر کر رہے ہوتے اور اگر اتفاق سے دلیپ سنگھ آ جاتا تو دونوں اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔ بظاہر وہ ان کی اس حرکت پر خفگی کا اظہار کرتا مگر دل میں ان کا پیار دیکھ کر خوشی محسوس ہوتی۔

کچھ دنوں سے دونوں میں بحث کا ایک مدّعا چھڑ گیا تھا۔ جوان خون اپنی بات منوانے پر آمادہ تھا تو بزرگ اپنی زندگی کے تجربات سے اسے آگاہ کرنے پر بضد تھا۔ آج تک امر سنگھ نے رنبیر کی کوئی فرمائش، کوئی بات ٹالی نہ تھی۔ اسے انکار سننے کی عادت ہی نہ تھی اور اسی لیے وہ ضد پر اَڑا تھا۔ دوسری طرف امر سنگھ کو اپنی زمین اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اسے اپنی زمین سے جدا ہونے کے خیال سے بھی وحشت ہوتی تھی۔ دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون، پوتا بالکل دادا کی پرچھائیں اور دونوں ضدّی اپنی اپنی ضد پر اَڑ گئے اور دونوں کے بیچ کی کڑی دلیپ سنگھ اس رسّہ کشی کے کھیل میں پھنس گیا۔

پنجاب میں ایک نئی وبا پھیلی تھی۔ شہر پھیل رہے تھے اور گاؤں سمٹ رہے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے بلڈر گاؤں کے سیدھے سادے کسانوں اور زمین داروں کو پیسے کی چمک سے چکا چوند کر رہے تھے۔ انھیں زمین کے عوض میں اتنی موٹی رقم دکھا رہے تھے کہ جس کا کبھی انھوں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ سات جنم بھی وہ زمین سے اتنا پیسہ نہیں کما سکتے تھے جتنا انھیں مل رہا تھا۔ ان کے گاؤں کے ایک چھوٹے کسان نے اپنی ایک ایکڑ زمین کا سودا ڈیڑھ کروڑ میں کر دیا تو لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پورے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور جب پیسہ بولنے لگا اور اپنا رنگ دکھانے لگا تو سبھی لوگوں کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ دھیرے دھیرے کھیت بکنے لگے اور لوگوں کے گھروں کے آگے بڑی بڑی چمچماتی گاڑیاں، جوان لڑکوں کے نیچے نئے موٹر سائیکل اور مکانوں کی صورتیں بھی سنورتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ شہری ٹھیکے دار کتّے کو ہڈی ڈالنے والا کام کر رہے تھے اور غریب کسان

رال ٹپکاتے ہڈی کے پیچھے بھاگنے لگے۔

امر سنگھ کی گاؤں میں بڑی عزت تھی۔ ہر کسی کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتا اور ہر ضرورت مند کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتا۔ اس نے جب گاؤں والوں کو اس جال میں پھنستے دیکھا تو تڑپ اٹھا۔ لوگوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی پر پیسہ کی چمک اتنی تیز تھی کہ کسی کے کان تک اس کی بات پہنچی ہی نہیں۔ لوگ اب اسے دیکھ کر راستہ بدلنے لگے۔ وہ لوگوں کو نصیحت دیتا رہا اور آندھی نے اس کے گھر کا رُخ کر لیا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ یہ آندھی ایک روز اس کے گھر کی بنیاد بھی ہلا دے گی۔

اس دن وہ اپنے صحن میں بچھے دیوان پر دُھوپ میں بوڑھی ہڈّیوں کو سینک رہا تھا کہ گلی میں ایک بڑی سی گاڑی آ کر رُکی۔ رنبیر کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''باپو جی یہ بھنڈاری صاحب ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔'' رنبیر نے گھستے ہی کہا۔

''کس سلسلے میں؟'' انھوں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ یہ زمینوں کا دلال ہو سکتا ہے۔

''آپ کی جو پانچ ایکڑ زمین ہے اس کے بارے میں۔''

''ہمیں اپنی زمین نہیں بیچنی۔''

''آپ ایک بار سن تو لیں کہ آپ کو ہم کیا دام دینا چاہتے ہیں۔''

''جس گلی جانا ہی نہیں اس کا راستہ کیا پوچھنا۔ مجھے اپنی زمین نہیں بیچنی اور کسی بھی قیمت پر نہیں اس لیے اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔''

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے اٹھے اور بہو کو مہمان کے لیے لسّی لانے کو کہہ کر اندر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دس پندرہ منٹ بعد رنبیر غصّے سے کمرے میں داخل ہوا۔ باپو جی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دلیپ بھی رنبیر کے پیچھے آن پہنچا۔

''باپو جی! یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔''

''پتّر جی جس بات کی آپ کو سمجھ نہ ہو آپ کو وہ بات نہیں کرنی چاہیے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں دنیا بے وقوف ہے اور صرف ہم لوگ ہی سمجھ دار ہیں؟''

''پہلے تو آواز نیچے کر کے بات کر، یہ کیا طریقہ ہے باپو جی سے بات کرنے کا؟''
دلیپ سنگھ نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''تو رہنے دے دلیپ، مجھے اس سے بات کرنے دے۔ ہاں تو پتّر جی مجھے بتاؤ میں زمین کیوں بیچوں؟ اس زمین میں میرے پرکھوں کا میرے اپنے باپ کا خون پسینہ رچا ہے۔ تو شاید نہیں جانتا کہ میرے باپ کی آخری تمنا کیا تھی؟ ان کے جسم کی راکھ کو کرت پور یا ہری دوار گنگا میں نہیں پرواہ کیا تھا۔ اُسے اِنھی کھیتوں میں بکھیر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مٹی کے کن کن میں ان کا وجود سما جائے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنی زمین کے کن کن میں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور تُو چاہتا ہے میں اس زمین کو بیچ دوں۔ نہیں یہ نہیں ہوگا۔ میرے مرنے کے بعد بھی دلیپ اور تو میری مٹی میرے کھیتوں میں بکھیر دینا میری بھی یہ آخری خواہش ہے۔''

''یہ تو جذباتی پہلو ہے، باپو جی دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ کچھ عملی طور پر بھی سوچنا چاہیے۔ جذباتوں کے سہارے زندگی تو نہیں کٹتی؟''

''تجھے کسی چیز کی کمی ہے؟ کیا ہم نے تیری ہر خواہش، ہر ضرورت پوری نہیں کی؟''
دلیپ کو رنبیر کا اس طرح باپو جی سے بحث کرنا پسند نہیں آ رہا تھا۔

''اگر زندگی میں کوئی سنہرا موقع ملے تو چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

''تو بتا اس میں عقلمندی کیا ہے؟'' باپو جی نے رنبیر سے پوچھا۔

''آج کل کھیتوں پر سارا کام مزدور ہی کرتے ہیں یا پھر زمین ٹھیکے دار کو دے دو۔ پچھلے کچھ سالوں سے مزدوروں کی کتنی قلّت ہوگئی ہے۔ جو مزدور سو روپے دہاڑی پر مل جاتا تھا آج تین سو سے کم کی بات نہیں کرتا۔ اگر قدرت نے ساتھ دیا تو فصل اچھی ورنہ چھ مہینے کی محنت گئی پانی میں۔ اس وقت تو سائنس بھی کام نہیں کرتی۔ اتنی محنت کے بعد بچتا کیا ہے؟

آج ہمیں سنہرا موقع مل رہا ہے پیسے کمانے کا۔ ایک ایکڑ کے بدلے آج دو کروڑ مل رہا ہے اس طرح دس کروڑ مل جائے گا ہمیں پانچ ایکڑ زمین کا۔ دس کروڑ کتنی بڑی رقم ہوتی ہے؟ کبھی سپنے میں بھی اتنے روپے دیکھے نہ ہوں گے۔ بڑا مکان، پیسے بینک میں رکھو اور بیاج کی رقم سے جو چاہے کرو۔ نہ محنت نہ مشقت نہ مزدوروں کی سر دردی نہ فصل خراب ہونے کا خوف نہ اسے بازار میں بیچنے کا جھنجھٹ۔''

دونوں باپ بیٹا، اس کی بات غور سے سن رہے تھے اور اس کے چہرے کی چمک کو بھی دیکھ رہے تھے۔

''اب تم میرے سوال کا جواب دو۔ جس طرح سبھی لوگ اپنی زمین بیچ رہے ہیں، کھیت ختم کر کے یہاں بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا منصوبہ ہے۔ اگر اسی طرح کھیت ختم ہو گئے تو کھاؤ گے کیا؟ جب اناج کی پیداوار ہی نہ ہو گی تو کیا اینٹ، پتھر، مٹی ریتی، سیمنٹ سے پیٹ بھرو گے؟ کیا اناج بھی دوسرے ملک سے مانگ کر کھاؤ گے؟''

''باپو جی، یہ تو سرکار کو سوچنا ہے۔ ہماری سرکار نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ اجازت دی ہو گی۔ انھوں نے بھی تو عوام کے بارے میں کچھ سوچا ہو گا؟''

''خاک سوچا ہو گا۔ سب کو اپنے فائدے کی پڑی ہے۔ ملک کی کون سوچتا ہے؟ پہلے پنجاب کی زمین سونا اُگلتی تھی۔ دھیرے دھیرے پچاسی فیصد سے کم ہو کر کھیتی باڑی کی زمین ساٹھ فیصد رہ گئی۔ میں تو آنے والی نسل کے مستقبل کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوں۔ گاؤں کا نوجوان شہر بھاگ رہا ہے اور شہر کا بیرونی ملک۔ کوئی بھی مٹی سے جڑنا نہیں چاہتا۔ سب کو آرام کی، عیش کی زندگی چاہیے۔ یہاں محنت نہیں کریں گے اور بیرونی ملک جا کر چاہے جھاڑو مارنا پڑے، برتن صاف کرنے پڑیں وہ بھی ہنس ہنس کر کر لیں گے۔''

''باپو جی، زمانے کے ساتھ چلو۔ اس لیے کہہ رہا ہوں لکشمی جی نے ہمارے دروازے پر دستک دی ہے اسے ٹھکراؤ مت۔''

''پتر جی چاہے وہ ٹھیکے دار مجھے دس کروڑ دے یا پندرہ میں اپنی زمین نہیں بیچنے والا۔

اس لیے بحث مت کرو۔''

''ویسے باپو جی رنبیر کی باتوں میں دم تو ہے۔ سال بھر میں اتنی محنت کے بعد اتنے پیسے نہیں آئیں گے جتنے اس کے بیاج کے آ جائیں گے۔''

''دلیپ تو بھی اس کی باتوں میں آ گیا؟ تُو تو سمجھ دار ہے، مجھے بتا پیسہ ٹکا ہے آج تک کسی کا؟ تجھ سے میں ایسی باتوں کی امید نہیں کرتا۔''

''جی مجھے اس بات میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ ہرج ہی کیا ہے۔''

بات بیچ میں ہی ٹوک کر انھوں نے یہ کہہ کر اپنا فیصلہ سنا دیا کہ ''میرے جیتے جی ایسا ہرگز نہیں ہوگا یہ بات اپنے پلّے باندھ لو۔''

رنبیر پیر پٹکتا کمرے سے باہر نکل گیا اور دلیپ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے میز پر پڑی ان کی دوائیاں دیکھنے لگا۔ وقتی طور پر بات وہیں ختم ہو گئی مگر اس کے بعد رنبیر نے اٹھتے بیٹھتے اپنے باپ کے کان بھرنے شروع کر دیے مگر دوبارہ دلیپ سنگھ نے باپو کے سامنے اس بات کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ باپو جی کا فیصلہ اٹل ہے، وہ ٹس سے مَس نہیں ہوں گے۔ ٹوٹ جائیں گے مگر جھکیں گے نہیں۔ اُن کا اپنی زمین سے لگاؤ کسی سے چھپا نہیں تھا۔ اس نے ان کی کبھی کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ ان کے کہے کو ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹھیکے دار کی آمد اور اس سے ہوئی گفتگو کا ذکر بھی ان سے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس بار ٹھیکے دار ایک نئی تجویز لے کر آیا تھا۔ ان کے کھیتوں کے ساتھ لگی زمین پہلے ہی ٹھیکے دار خرید چکا تھا اور اگر وہ ہاں کر دیتے ہیں تو وہ منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہے۔ وہ یہ تک کہہ گیا ہے کہ اس زمین پر بننے والے فلیٹوں میں سے ایک فلیٹ اور ایک دُکان بھی دینے کو تیاّر ہے اور اس کے ساتھ فی ایکڑ دو کروڑ کے حساب سے پانچ ایکڑ کے دس کروڑ بھی دینے کو تیاّر ہے۔ جو اس نے پہلے کسی کو نہیں دیا۔ لیکن اس کی تجویز قابلِ غور ضرور تھی جسے سُن کر بڑے بڑوں کی رال ٹپک پڑتی، مگر باپو جی کو کیسے منائے۔ رنبیر سے وہ ٹھیکے دار پہلے ہی بات کر چکا تھا، اس نے باپو جی کو راضی کرنے کے لیے ٹھیکے دار کو گھر بھیجا تھا مگر دلیپ سنگھ نے باپو جی کی طبیعت کو

دیکھتے ہوئے اس کی بات سُن کر باہر سے ہی بھیج دیا۔

رنبیر آیا تو باپو جی سو رہے تھے اور دلیپ سنگھ پاس ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے کتاب کھول کر اسے پڑھ رہے تھے۔

''کیسی طبیعت ہے باپو جی کی؟''

''سو رہے ہیں! تو جا، انھیں آرام کرنے دو۔''

''آپ جا کر سو جاؤ، آج میں باپو جی کے پاس سو جاتا ہوں۔''

''نہیں، تم لاپرواہو، رات کو جاگنا پڑتا ہے باپو جی کے ساتھ۔ اگر ذرا سی بھی طبیعت خراب ہوئی تو تمھیں پتہ بھی نہ چلے گا، گھوڑے بیچ کر سوتا ہے تو، تو جا میں ٹھیک ہوں یہاں۔''

''میں کہتا ہوں تم دونوں جا کر آرام کرو، آج پورن لیٹ جائے گا میرے کمرے میں۔'' باپو جی نے بند آنکھوں سے ہی کمزور آواز میں دونوں کو پیار سے کہا۔

''باپو جی! آپ جانتے ہیں مجھے کسی پر بھروسہ نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ دوسرے کمرے میں مجھے چین نہیں آئے گا۔''

''جیتا رہ پُتّر! آج کے زمانے میں خوش قسمتی سے ہی تیرے جیسی اولاد ملتی ہے۔'' انھوں نے آنکھیں کھول کر بیٹے کو دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ بے ساختہ ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

صبح اُٹھتے ہی رنبیر نے پھر وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ بیٹے کا اصرار تھا کہ اس سے اچھے موقعے کبھی کسی کو نہیں ملے اور یہ موقع ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہیے، کسی بھی طرح باپو جی کو راضی کرو۔ وہ بیٹے کو سمجھا رہا تھا کہ باپو جی بیمار ہیں، جذباتی طور پر اس زمین سے جڑے ہیں، وہ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ بس دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں دلیلیں پیش کر رہے تھے۔ پہلے بات چیت نے بحث کی شکل اختیار کی اور جب بحث میں غصہ شامل ہو گیا تو دونوں کی آوازیں بھی اُونچی ہو گئیں۔ رنبیر کی ماں شور سُن کر رسوئی گھر سے بھاگی آئی اور بیچ بچاؤ کرنے لگی۔ اُدھر باپو جی ان دونوں کی آوازیں سن کر بہت مشکل سے بستر چھوڑ کر

دروازے تک پہنچ گئے۔

''دلیپ یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' کمزوری کے باوجود آواز میں رُعب تھا۔

''آپ کیوں چلے آئے؟ یہ تو پاگل ہو گیا ہے باپو جی۔'' وہ انھیں دیکھ کر ادھر لپکا۔

''ہاں ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ مگر ایک بات آپ دونوں سن لیں کہ اگر میری بات نہ مانی تو میں بھی گرودیو کے پاس کینیڈا چلا جاؤں گا۔ پھر پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ بیٹھے رہنا زمین سے چپک کر۔''

''دھمکی دے رہا ہے؟'' دلیپ نے وہیں رُک کر غصّے سے پوچھا۔

''دھمکی نہیں سمجھنا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

''دلیپ یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''باپو جی آپ اندر چلیے بولنے دو اسے۔'' وہ انھیں پکڑ کر بستر تک لے آیا۔

وہ رنبیر کے بارے میں پوچھتے رہے مگر اس نے باتوں کا رُخ ہی بدل دیا۔

اس رات دلیپ سنگھ سو نہ سکا۔ بیٹے کے بدلتے برتاؤ سے وہ پریشان بھی تھا اور دُکھی بھی۔ اس سے پہلے کبھی کوئی ٹکراؤ، کوئی اختلاف یا بغاوت کی ہوا اس گھر کو چھو کر نہیں گئی تھی۔ دادا اور پوتا دونوں اپنی اپنی بات پر اَڑے ہوئے تھے اور ان دونوں کے بیچ کی کڑی اس رسّہ کشی کے کھیل میں پِس رہی تھی۔ اسے باپ اور بیٹے دونوں کی خوشی چاہیے تھی۔ نہ تو وہ بیٹے کو کھونا چاہتا تھا اور نہ ہی باپ کو ناراض کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوئی ایسا راستہ نہیں سجھائی دے رہا تھا جس سے پھر سے گھر کا سکون اور خوشیاں لوٹ آئیں، دونوں راضی ہو جائیں۔ گھر کے تناؤ بھرے ماحول میں اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ ہر بیتتے دن کے ساتھ اس کے دل اور دماغ پر بوجھ بھی بڑھ رہا تھا۔ نیند نے آنکھوں سے دشمنی کر لی تھی۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہتا اور اُٹھ اُٹھ کر باپو جی کو دیکھتا رہتا۔

رنبیر اندھیرے منہ بنا کچھ کھائے پیئے نکل جاتا۔ اس نے باپو جی کے کمرے میں آنا بھی بند کر دیا۔ دو روز اسی پریشانی اور کشمکش میں گزر گئے۔ بیٹے کی بغاوت، باپو جی کی بیماری

اور بیٹے کو لے کر بیوی کی طعنہ زنی نے اسے بے چین کر دیا۔ اس ذہنی پریشانی سے نجات پانے کے لیے اس نے باپو جی کو دوائی دینے کے بعد خود بھی ایک نیند کی گولی کھالی تاکہ سکون سے سو سکے اور پھر وہ آرام سے گہری نیند سویا رہا۔ نہ ہی وہ اُٹھا اور نہ ہی باپو جی نے اُسے اٹھایا۔ بہت دنوں بعد اتنی گہری نیند نصیب ہوئی تھی۔

صبح بیوی نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ پورن باپو جی کے سرہانے کھڑا رو رہا تھا، اور بیوی بول رہی تھی:

''باپو جی کوئی جواب نہیں دے رہے۔ جلدی اُٹھو۔ آپ پاس سو رہے ہو، گھوڑے بیچ کر پتہ نہیں چلتا کیا ہو رہا ہے؟'' وہ ہڑبڑا کر اُٹھا تو دیکھا باپو جی کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ان کے چہرے پر درد کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں اور جسم اکڑ چکا تھا۔ معلوم نہیں دم توڑنے سے پہلے کتنی تکلیف سہی ہوگی۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر وہ ان کے مردہ جسم سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا رونا سن کر آس پڑوس کے لوگ بھی چلے آئے اور بڑی مشکل سے اسے سنبھالا، ان کے بے جان جسم سے اسے الگ کیا مردہ جسم کو کمرے سے نکال کر دالان میں ڈال دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دالان لوگوں سے بھر گیا۔ رنبیر بھی سب گلے شکوے بھول کر باپو جی کے آخری سفر کی تیاریوں میں جٹ گیا۔ وہ دلیپ سنگھ کو بھی دلاسہ دے رہا تھا اور سب کام بھی دیکھ رہا تھا۔ جب ان کا جنازہ اٹھنے والا تھا تو دلیپ سنگھ اُٹھ کر باپو جی کے کمرے میں گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کمرے میں کوئی نہیں تھا پھر اس نے اپنے بستر پر پڑے تکیے کے نیچے سے باپو جی کا اِن ہیلر نکالا اور چپ چاپ باپو جی کے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور جنازے کو کندھا دینے سب سے آگے پہنچ گیا۔

OO

بدلی میں چھُپا چاند

شبنم نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ سنجوگی ہماچل کے کسی چھوٹے سے قصبے کا نام ہے مگر ہماچل کے کس حصے میں ہے، یہ جاننے کے لیے مجبوراً اپنے پاپا سے پوچھنا پڑا۔ اس کی زبان سے سنجوگی کا نام سن کر وہ اس طرح چونکے جیسے بجلی کے ننگے تاران کے جسم کو چھو گئے ہوں۔ کچھ پل وہ خاموش اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور جب اس کی آنکھوں کی تاب نہ سہہ سکے تو منھ دوسری طرف پھیر کر کھڑکی سے باہر لان میں بیٹھے رشتے داروں کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک لمبی خاموشی جب ناقابلِ برداشت ہو گئی تو شبنم نے ہی اس سلسلے کو توڑا۔

''میں کل ہی سنجوگی کے لیے نکل جاؤں گی۔ آپ بتا دیں گے کہ یہ جگہ کہاں پر ہے تو بہتر ہوگا ورنہ نیٹ پر سب جانکاری مل جائے گی۔''

''ماں نے تمھیں بتایا ہے؟''

''ہاں!''

ایک سرد آہ روی ورما کے دل سے نکلی۔

''وہاں جا کر اب کیا کرو گی؟'' اپنا ہی سوال انھیں بڑا بے معنی سا لگا۔ ابھی دو چار جلی کٹی باتیں جوان بیٹی سے سننی پڑیں گی۔

مگر وہ خاموش رہی۔ چاہتی تو تھی کہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے تا کہ اس کے دل پر چھایا غبار چھٹ جائے مگر دادی سے کیا وعدہ حائل ہو گیا۔ ہر بار کی طرح یہ سوال بھی ضبط

کر گئی۔ صبر کا مادّہ بہت زیادہ تھا اس لیے پیمانہ چھلکنے نہیں دیا۔

''گھر پر سب رشتے دار آئے ہوئے ہیں۔ پرسوں ماں کا چوتھا ہے۔ سب لوٹ جائیں گے۔ پھر چلی جانا۔ کل ہی ٹکٹ منگوا دوں گا۔''

وہ چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔ زندگی کے بیس سال تو اس نے گزار دیے مگر اب یہ دو دن گزارنے اسے بھاری لگ رہے تھے۔ وہ تو بچپن سے اپنے ہی گھر میں اجنبی تھی۔ مہمانوں کی طرح سال میں دو بار آتی اور کچھ دن گزار کر واپس ہوسٹل لوٹ جاتی۔ اپنا گھر، اس گھر کی خوشی، اس کا سکون اس کا آرام کیا ہوتا ہے، اس کا اسے احساس ہی نہیں تھا۔ ایک بھرا پُرا پریوار ہے اس کا جس میں دادی، پاپا، ماں اور چھوٹی بہن رہتی ہیں۔ اتنے سارے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی اس نے خود کو ہمیشہ تنہا ہی محسوس کیا۔

روی ورما بیٹی کے جاتے ہی آرام کرسی پر نڈھال سے گر پڑے۔ ذہن کی تھکن سے بوجھل ان کی آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں اور ماضی کا تیز جھونکا، ان کے وجود کو لرزا گیا۔ جس سچائی کو انھوں نے دفن کر دیا تھا وہ ایک بار پھر ان کے سامنے بے حیائی سے منہ چڑھانے لگی۔ گڑے مردے اُکھڑنے کا انھیں خوف تھا۔ برسوں سے ان کے سینے پر پڑے بوجھ کا احساس اور زیادہ بڑھ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دامنی کی صورت ان کی آنکھوں کے آگے گھوم گئی۔ اس کا چیخ چیخ کر پکارنا اور آنسوؤں سے تر چہرہ ان کی آنکھوں کے آگے گھوم گیا اور اس منظر سے بچنے کے لیے انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ سبھی رشتے دار ماں کی موت کی خبر سن کر ماتم پرسی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان سب میں بیٹھ کر وہ ماضی کے کھرونچوں کو مٹا دینا چاہتا تھا مگر رہ رہ کر یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ جو بات ماں بیٹے نے دنیا سے چھپا کر رکھی تھی وہ ماں نے جاتے جاتے شبنم کو بتا دی۔ اس کی زندگی میں ایک اور طوفان کیوں کھڑا کر دیا؟ یہ وہ طوفان تھا جس کا سامنا اسے آنے والے دنوں میں اکیلے ہی کرنا ہوگا۔ اس کی زد میں اس کی زندگی

آ چکی ہے جو اس کے ہرے بھرے گلشن کو تباہ بھی کر سکتی ہے۔

دادی کے چوتھے کی رسم کے بعد اس نے اپنا سامان باندھ لیا تھا۔ اس نے انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات حاصل کر لی تھیں کہ ننجوگی منالی سے تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کی دوری پر بسا ہوا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح ماں نے کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی رُکنے کو کہا۔ ان کے لیے اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ البتہ پاپا نے اسے ٹکٹ تھماتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا کہ ''کچھ دن رُک جاتی۔''

''نہیں! زیادہ چھٹّی نہیں ملی۔ آج کل کے حالات تو آپ جانتے ہیں۔ ریسیشن کا دور ہے۔ دو منٹ میں نکال باہر کرتے ہیں اور پھر دو تین روز تو مجھے ننجوگی میں بھی لگ جائیں گے۔''

ننجوگی کے ذکر سے وہ پھر خاموش ہو گئے۔

''دادی سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ سے جھگڑا نہیں کروں گی مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بیس سال میں محرومیوں کی کھائی میں گری رہی، آسمان پر چمکتے تاروں میں انھیں تلاش کرتی رہی اور آپ میرے درد سے ناآشنا رہے اور خاموشی سے سب دیکھتے رہے۔ میں آپ کو اس سب کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''یہ کس بات کی معافی دے رہی ہے بیٹی باپ کو؟'' ماں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

روی ورما بیوی کو دیکھتے ہی سٹپٹا گئے اور وہ چھلکتی آنکھوں سے کمرے کے باہر اور پھر گھر سے باہر ایک نئے سفر پر نکل پڑی۔

دلی سے بھنتر تک کی اس نے طے شدہ فلائٹ پکڑ لی۔ جیسے ہی جہاز نے پرواز بھری اس نے ذہن میں دو دن سے مچی کھلبلی میں کچھ راحت محسوس کی۔ آنکھیں بند کر کے وہ آرام سے سیٹ پر بیٹھی پھر یادوں کے سمندر میں غوطہ کھانے لگی۔ ایک دھندلی سی تصویر، جسے اس نے اتنے سالوں میں کئی بار صاف کرنے کی کوشش کی مگر وہ صاف نہ ہو سکی۔ ایک خوبصورت جوان عورت، جس کا دمکتا ہوا رنگ، ماتھے پر بڑی گول سی لال بندیا اور سندور سے سجی مانگ، جس کے آنچل کی ٹھنڈی چھاؤں میں اس نے ممتا کا میٹھا رَس چکھا اور پھر ایک روز آنچل کی

چھاؤں سے وہ محروم ہوگئی۔ وہ ایک ایسے ننھے پودے کی مانند دھوپ اور برسات میں کھڑی تھی جہاں نہ زندگی کی تپش سے بچنے کے لیے چھاؤں اور نہ طوفان سے بچنے کا کوئی سہارا تھا۔ اس کی زندگی میں کڑواہٹ بھر گئی اور وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ نئی ماں آئی تو باپ بھی پرایا ہوگیا۔ روی ورما جو ساری عمر اپنی ماں کا پلو پکڑ کر بیٹھا رہا اب دوسری بیوی کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ وہ اس پر اس طرح حاوی ہوگئی کہ ماں کے وجود کو پیچھے دھکیل کر خود اپنی سیاست جمالی۔ پھر جب اس کی اپنی گود بھری تو پانچ سال کی شبنم کو گھر سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا اور شملہ کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخلہ دلا دیا گیا۔ ماں کی ممتا، باپ کا پیار، دادی کا دُلار کیا ہوتا ہے یہ اسے معلوم ہی نہیں ہوسکا۔ اس کے وجود نے گھر کی گرماہٹ کی جگہ ہاسٹل کی سرد دیواروں میں ہی پناہ تلاش کرلی۔ کانونٹ کی ننز سے اسے دلار ملا اور دوستوں سے بہن بھائیوں کا پیار۔ کتابیں اور کانونٹ ہی اس کے جینے کے سہارے تھے۔ اسکول کی پڑھائی مکمل ہوئی تو بنگلور میں انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ پانچ سال کی عمر میں اس کا گھر جو چھوٹا تو ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ انجینئرنگ ختم ہوتے ہی بنگلور میں ہی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت بھی مل گئی۔ وہیں اس نے دو کمروں والا فلیٹ کرایے پر لے لیا اور اب کہیں جا کر اسے اپنا گھر نصیب ہوا۔

پاپا کا فون مہینے میں دو تین بار حال دریافت کرنے کو آجاتا تھا۔ بات بڑی مختصر ہوتی۔ ایک رسمی سا رشتہ جو تھا دونوں کے بیچ۔ اسے ان سے مل کر، بات کر کے ہمیشہ سے یہی لگا کہ وہ اپنے نہیں ریتکا کے پاپا سے بات کر رہی ہے۔ ریتکا کی طرح کبھی اس نے پاپا سے کھل کر بات نہیں کی، نہ ہی کبھی اس کی طرح کوئی فرمائش کی اور نہ ہی ضد۔ ماں نے کبھی اسے اپنانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی البتہ وقت کے ساتھ دادی کا رویہ بدل گیا تھا مگر اکیلے جینے کی عادت نے رشتے کی گرماہٹ محسوس نہیں ہونے دی۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ دادی کو اس کی جگہ پوتا چاہیے تھا اور اس کی پیدائش پر وہ بڑی مایوس ہوئی تھی۔ بچپن میں ملے زخم آسانی سے نہیں بھرتے شاید اس لیے جب پاپا نے فون پر دادی کی دن پر دن بگڑتی صحت کی خبر دی تو اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ دو دن بعد پھر فون آیا کہ 'فوراً چلی آؤ ماں تمھیں آخری بار دیکھنا

چاہتی ہے'۔ شام کی فلائٹ سے ہی وہ دلّی پہنچ گئی۔

دادی شاید اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی ہلکے سے مسکرائی۔ بڑی مریل سی آواز میں پاس بلایا۔ وہ پاس جا کر بیٹھ گئی۔ واقعی دادی بہت کمزور ہوگئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کتنی رُعب دار شخصیت تھی ان کی۔ آواز اتنی کڑک کہ کیا مجال کسی کی کہ ان کی بات اَن سنی کر دے اور اب وہی تنا ہوا جسم ڈھل چکا تھا۔ آواز اتنی کمزور کہ حلق سے باہر سوچ کر نکلتی تھی۔ بنا سہارے کے چلنا تو دور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ بڑھاپا بھی کتنی ظالم شے ہے، انسان کو کمزور، لاچار اور مجبور بنا دیتا ہے۔

دادی نے کانپتے ہاتھوں سے چھوا تو وہ خیالوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ اس نے سب کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا اور اسے اور قریب آنے کو کہا۔

''تجھ سے بات کیے بنا شاید مجھے موت بھی نہ آئے گی۔ ایک بوجھ ہے میرے ضمیر پر۔''

''کیسا بوجھ دادی؟''

''تجھ سے معافی مانگنی ہے۔''

''مجھ سے! کس بات کی؟'' اس نے تھوڑا آگے بڑھ کر دادی کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''پہلے وعدہ کر اپنے باپ سے جھگڑا نہیں کرے گی۔''

''جھگڑا تو دُور کی بات ہے آپ ہی بتایئے میں نے آج تک کبھی کسی بات کا گلہ بھی کیا ہے؟ پھر بھی آپ کی تسلّی کے لیے وعدہ کرتی ہوں۔ آپ بات بتایئے۔''

اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ بات کچھ خاص ہی ہے جو دادی اس طرح کی تمہید باندھ رہی ہے۔

''تیری ماں زندہ ہے۔''

''کیا؟'' دادی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھنے لگی۔

''میری ماں زندہ ہے اور مجھے پتہ بھی نہیں۔ کہاں ہے میری ماں؟''

''سنجو گی کے پاگل خانے میں۔'' اتنا کہہ کر دادی نے ایک آرام کی سانس لی جیسے دل

پر پڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔

اسے اس طرح حیران دیکھ کر وہ آگے بولی۔

''تیرے جنم کے بعد سے ہی وہ بیمار ہوگئی۔ساری غلطی میری ہے۔مجھے پوتا چاہیے تھا اور وہ پوتا دے نہ سکی۔ہم ماں بیٹے کی باتوں کو اس نے دل سے لگالیا اور ذہنی تناؤ اتنا بڑھ گیا کہ وہ یہ سب برداشت نہ کرسکی اور دماغی توازن کھو بیٹھی۔''

''مگر آپ کو پوتا کہاں ملا؟''

''پوتے کی چاہ میں میں نے بیٹا بھی گنوادیا۔''

''اب بھی کیا وہ وہی ہیں؟''

''ہم لوگ وہاں سے بنا کسی کو بتائے چلے آئے۔دوبارہ جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ سب سے تو یہی کہا تھا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ ایک دم سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے جانا ہوگا وہاں۔میں پتہ لگاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکلنے لگی تو دادی نے آواز دے کر روک لیا۔

''جانے سے پہلے ایک بار کہہ دے کہ مجھے معاف کیا۔'' انھوں نے دونوں کمزور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میں کون ہوتی ہوں آپ کو معاف کرنے والی۔آپ نے جو کیا ہے اس کا حساب تو اوپر والا ہی کرے گا۔''

یہ کہہ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔اسی شام دادی نے دم توڑ دیا۔

بھنتر فلائٹ پہنچنے کا اعلان ہوا تو اس نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا،خوشی اور غمی کے ملے جلے احساسات دل میں سموئے اپنی منزل کی اور بڑھ گئی۔

منالی کی خوبصورت وادیاں اسے متاثر نہ کرسکیں۔پہاڑوں کے بیچوں بیچ سے نکلتی ہوئی گھماؤدار سڑکوں پر ٹیکسی اپنی رفتار سے چلی جارہی تھی۔شہر سے نکلتے ہی ہرے بھرے کھیت اور سیبوں سے لدے پیڑوں کا نظارہ دیکھنے کے بجائے اس نے پرس میں سے ایک تصویر

نکالی جس میں ایک چھوٹی سی تین سال کی بچی ماں کی گود میں سکون سے بیٹھی ہے۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''ماں۔''

'ماں' کتنی مٹھاس ہے اس لفظ میں۔ وہ بار بار 'ماں' 'ماں' دہرانے لگی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ لفظ اس کے لیے بالکل اجنبی ہے اور ابھی ابھی اس سے جان پہچان ہوئی ہے۔ لفظ ہی کیا وہ تو خود اپنی ماں کے لیے اجنبی ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ بیس سال تک کسی نے ان کی خبر نہیں لی۔ اسی کشمکش میں ٹیکسی والے نے پہاڑی پر بنے پرانی حویلی نما اسپتال کے آگے آ کر گاڑی روک دی۔ چاروں طرف لمبے لمبے چیل کے درخت، سائیں سائیں کرتا ہوا شور اور فضا میں کھلی چیل کی تازہ خوشبو۔ اس پُرکشش ماحول میں پہنچتے ہی اس کے سفر کی تھکن دُور ہو گئی۔

ٹیکسی والے کو وہیں رُکنے کی ہدایت دے کر وہ اسپتال کے اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی کمرے کے باہر ڈاکٹر رائے سی ایم او کی تختی لگی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ ان کے سامنے تھی۔

''ڈاکٹر صاحب میں ایک مریض کے بارے میں جاننے آئی ہوں۔''

''کون سے مریض کے بارے میں؟''

''کوئی بیس سال پہلے یہاں دامنی نام کی ایک عورت کو داخل کروایا گیا تھا اس کے بارے میں مجھے جاننا ہے۔''

یہ سنتے ہی ڈاکٹر بھڑک اٹھے۔

''بیس سال کے بعد آپ کو یاد آئی ہے اس کی؟ کیا سو رہے تھے اتنے سال؟ بیمار سے پیچھا چھڑا کر بے فکر ہو کر آرام سے جیتے رہے یہ سوچ کر کہ چلو بلا ٹلی؟''

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس سچائی کو وہ کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ شرمندگی، اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے تو دو روز پہلے ہی ان کے بارے میں پتہ چلا، پہلے پتہ ہوتا تو بھاگی چلی آتی۔ بنا ماں کے بیٹی کیسے بچپن پار کر کے جوانی میں پاؤں رکھتی ہے یہ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔''

ڈاکٹر رائے اس کی حالت دیکھ کر ایک دم سے شانت ہو گئے۔

''بیٹی ہو دامنی کی؟''

''جی۔''

''کیا چاہتی ہو؟''

''میں انھیں دیکھنا چاہتی ہوں، ملنا چاہتی ہوں۔ کیسی ہیں وہ؟''

''صرف دیکھنا اور ملنا چاہو گی یا پھر انھیں اپنے ساتھ لے کر بھی جاؤ گی؟''

''کیا؟ کیا ماں بالکل ٹھیک ہے؟ میں انھیں اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں؟''

''وہ تو پچھلے اٹھارہ سال سے بالکل ٹھیک ہے۔ اپنے لوگوں کے انتظار میں اس نے زندگی اسی اسپتال میں لوگوں کی خدمت کرتے گزار دی۔''

''پچھلے اٹھارہ سال سے وہ ٹھیک ہیں تو انھیں گھر کیوں نہیں بھیجا؟'' اس نے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا۔

''بیٹا، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایسے مریضوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنوں کو ہی ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ لوگ گھر شہر سب کچھ بدل لیتے ہیں اور مریض اپنوں سے ملنے کے انتظار میں زندگی گزار دیتا ہے۔ تمھاری ماں بھی ان میں سے ایک ہے۔''

یہ سن کر اسے زبردست دھکّا لگا کہ اتنا بڑا دھوکہ کیا گیا ماں بیٹی کے ساتھ۔ کس سے گلہ کرے اور کسے الزام دے۔ ابھی وقت نہیں ہے ان باتوں کا۔ ابھی تو اسے ماں سے ملنا ہے اور پھر اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا ہے۔ اسے انصاف بھی دلانا ہے۔ وہ ابھی یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر سامنے سے آتی ہوئی اس عورت پر ٹک گئی جس کے بال سفید ہو چکے تھے، چہرہ اُداس مگر رنگ صاف، ماتھے پر لال گول بندیا اور اسی رنگ کے سندور سے بھری مانگ وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

OO

مدد چاہتی ہے حوّا کی بیٹی

جب سے اُسے پتہ چلا تھا کہ اُس کے گاؤں کا پتہ چل گیا ہے اور بہت جلد یہ لوگ اُس کے ماں باپ کو ڈھونڈ نکالیں گے، اُس کی مایوس بجھی ہوئی آنکھوں میں اُمید کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ سانولے سلونے چہرے پر بڑی بڑی کالی آنکھیں اور دلکش ہوگئی تھیں۔ اُس کی خاموش آنکھیں بولنے لگی تھیں۔ زبان سے شوخی کا رس ٹپکنے لگا تھا۔ جو لوگ پچھلے پانچ سالوں میں اُس کی آواز سے ناآشنا تھے وہ اب اُس کی خوش گفتاری سے حیران زدہ تھے۔ پانچ سال پہلے، جب وہ دس سال کی تھی اس آشرم میں چالیس بچوں کے ساتھ رہنے آئی تھی۔ اس وقت وہ سب سے بالکل الگ تھلگ رہتی، خاموش خود میں سمٹی، تنہا گوشہ تلاش کرتی۔ دھیرے دھیرے شکنتلا دیوی، جو اس آشرم کو چلا رہی تھیں اور جنھیں سبھی چھوٹے بڑے پیار سے نانی کہتے تھے، اُن کی مسلسل کوشش اور دوسرے بچوں کے بار بار اصرار کرنے پر وہ سب کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگی تھی مگر نہ کسی سے بات کرنا نہ کسی کے سوال کا جواب دینا اور نہ ہی کبھی کسی کی شکایت کرنا اُس کی عادت میں شامل تھا۔ تھی تو وہ دس سال کی مگر اس کی سنجیدگی اور ٹھہراؤ ایسا کہ وہ عمر سے کہیں بڑی لگتی تھی جیسے اُس نے زندگی کے نہ جانے کتنے موسم دیکھ لیے ہوں، نہ جانے کتنی صدیوں سے وہ تنہا بھٹک رہی ہو۔ بھٹک تو وہ رہی تھی اپنوں کو پانے کے لیے، ترس تو وہ رہی تھی ماں کے ممتا بھرے آنچل میں سمٹنے کے لیے، تڑپ تو وہ رہی تھی باپ کی شفقت بھرے سایے کی ٹھنڈک کے لیے۔ دس سال تک اُس کی زندگی میں سب کچھ تھا۔ گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر جس کے آنگن میں تلسی سجی رہتی تھی جس کی پوجا اس کی ماں ہر صبح کیا کرتی تھی۔ اُس کے بابا رام دُلار، جو حصے میں ملی تھوڑی سی زمین پر دن

رات محنت کرتے۔ غریب ماں باپ کی اکلوتی بیٹی مہوا تتلیوں کی طرح سارا دن کودتی پھدکتی رہتی۔ سارا دن بچوں کے ساتھ مستی کرتی۔ ماں تالاب پر جانے کو منع کرتی مگر چنچل ہرنی رو کے کہاں رُکتی۔ اکثر وہ ماں کی نظریں بچا کر منّی، بلبل، راجو اور پریم کے ساتھ تالاب پر کھیلنے نکل جاتی۔ گھر لوٹتی تو ماں خوب ڈانٹتی۔ اسے ڈانٹتا دیکھ کر بابا ماں سے الجھ جاتے:

''میری بچی کو کچھ مت کہا کرو۔''

''کیوں نہ کہوں؟ معلوم نہیں کتنی شرارتی ہے، پانی میں شرارتیں کرے گی تو کون روکے گا اسے؟ ویسے اب یہ بڑی ہو رہی ہے گھر کے کام کاج میں اسے میرا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ سارا دن مستی، سارا دن گھومنا، یہ اچھی لڑکیوں کے لچھن نہیں ہیں۔''

''کیوں غصہ کرتی ہو۔ ابھی بچی ہے کھیلنے دو پھر زندگی بھر چولہا چوکا ہی تو کرنا ہے۔''

کبھی وہ اپنے ٹولے کے ساتھ امرود، آم اور جامن کے باغ کی طرف نکل جاتی۔ مالی سے نظریں بچا کر چھپ چھپ کر سبھی درختوں پر چڑھ جاتے اور مزے لے لے کر پھل توڑ کر کھاتے۔ اگر مالی کی نظر اُن پر پڑ جاتی تو وہ ڈنڈا لے کر گالیاں بکتا اُن کے پیچھے بھاگتا اور شام تک سب بچوں کے گھر شکایت پہنچ جاتی۔ ماں سنتی تو سر پیٹ کر رہ جاتی۔ اُس وقت بھی بابا بیچ میں آ کر اُسے بچا لیتے۔ دونوں کے بیچ بحث شروع ہو جاتی۔ وہ اطمینان سے اپنے بابا کے ساتھ ایسے چپک کر بیٹھ جاتی جیسے آندھی طوفان سے بچنے کے لیے کوئی مضبوط دیوار کے سایے میں چھپا ہو۔

رات کے سناٹے میں اکثر گاؤں کے گھر کی دھندلی یادیں اُسے اپنے حصار میں جکڑ لیتیں اور جب آنکھیں اُن تصویروں کے کھیل سے بوجھل ہو جاتیں تو نیند چپ چاپ اسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ مہوا کو وہ سب اچھی طرح یاد ہے جب وہ ماں بابا کے ساتھ گاؤں کے پاس ہی ندی پار کر کے شہر کا ساون کا میلا دیکھنے گئی تھی۔ آم کے باغوں میں عورتیں، لڑکیاں، بچیاں رنگ برنگے کپڑے پہن کر ہلکی ہلکی بوچھار میں بھی پینگے جھول رہی تھیں۔ ماں نے اسے بھی جب پینگ پر بیٹھا کر پیچھے سے جھولے کو دھکا دیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے رسّی کس کر تھام لی، پیٹ میں ہلکی ہلکی لہر اٹھتی اور وہ ہوا میں جھولتے اُس گدگدی

کو محسوس کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اس کی کھلکھلاہٹ سن کر، اس کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ماں بابا نہال ہو جاتے۔ میلے میں کبھی وہ بابا کے کاندھے پر بیٹھ کر گھومتی تو کبھی ماں کا آنچل پکڑے رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں دیکھ کر مچل اٹھتی۔ دونوں کلائیوں میں چوڑیاں ڈلوا کر انھیں اوپر اٹھا کر چھنچھناتی۔ خوشی میں ایسے جھوم اٹھتی جیسے بادلوں کو دیکھ کر مور ناچ اٹھتا ہے۔ ماں بابا کی آنکھوں کا تارا ان کے جینے کا سہارا۔ اسے دیکھ دیکھ جیتے تھے۔ وہ خود ایسے محسوس کرتی تھی جیسے وہ کسی ریاست کی شہزادی ہو۔

پھر ایک روز کچھ ایسی ہوا چلی کہ سب خوشیاں اپنے ساتھ اُڑا لے گئی۔ آنکھوں کا تارا ٹوٹ کر زمین پر اوندھے منہ گرا۔ ماں کا آنچل ہاتھوں سے پھسل گیا۔ بابا کی انگلی چھوٹ گئی۔ وہ ہاتھ کیا چھوٹا، اس کا گھر، اُس کا گاؤں یہاں تک کہ قصبہ ہی چھوٹ گیا۔ ایک شام تالاب پر کھیلتے کھیلتے راجو اور بلبل کے ساتھ اُس کا جھگڑا ہو گیا۔ روتے روتے وہ گھر کی طرف اکیلی ہی چل پڑی۔ اُسے روتا دیکھ کر مرلی چاچا نے پیار سے پچکارا، چپ کرنے کے لیے تھیلے میں سے دو امرود کیا دیے وہ اُن کی انگلی پکڑ راجو اور بلبل کی شکائتیں لگاتی اُن کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ گئی۔

شام کا سورج ڈھل رہا تھا اور اندھیرا روشنی نگلنے کو بے تاب تھا۔ مرلی چاچا کی انگلی پکڑے باتیں کرتے کرتے گاؤں کی سرحد پیچھے چھوٹ گئی۔ پہلی بار اتنی بڑی ریل گاڑی دیکھی اور خوشی خوشی اُس میں سوار ہو گئی۔ ایک دو بار ماں کے بارے میں پوچھا تو مرلی چاچا نے یہ کہہ کر بہلا دیا کہ: "تمھارے بابا کو بتا کر آیا ہوں کہ ہم ریل گاڑی کی سیر کرنے جا رہے ہیں۔ صبح لوٹ آئیں گے"۔ گاڑی میں ہی کھا پی کر جب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تو ہوا کے جھونکے اور سارا دن کی اُچھل کود نے جلد ہی اُس کی آنکھیں بوجھل کر دیں اور وہ مرلی چاچا کی گود میں سر رکھ کر سو گئی۔

صبح کی دھوپ جب آنکھوں پر پڑی تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسٹیشن کے ایک کونے والے بینچ پر وہ لیٹی ہوئی تھی اور لوگوں کا سیلاب اِدھر اُدھر جا رہا تھا۔ مرلی چاچا پاس ہی کسی آدمی سے بحث کر رہے تھے وہ آدمی کہہ رہا تھا۔

''یہ بہت چھوٹی ہے۔ بچی ہے ابھی، اس کی اتنی قیمت نہیں دوں گا۔''

''لڑکیوں کو جوان ہوتے دیر لگتی ہے کیا۔ کام تو اب بھی آ سکتی ہے۔ پہلے اوپر کے کام کروا لینا بعد میں یہ تمھیں کما کر دے گی۔''

''دو ہزار سے زیادہ نہیں دوں گا۔''

''تین ہزار کا قرض لیا تھا اس کے باپ نے، اُس کی وصولی کرنی ہے۔ پانچ دیتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں چلا اگلی دُکان پر۔'' یہ کہہ کر اُس نے مہوا کا بازو پکڑا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے چلنے لگا۔ اتنے میں اُس آدمی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟''

''بے فکر رہو وہ اتنی دور کبھی نہیں آ سکتا۔ کنویں کا مینڈک کنویں میں ہی رہے گا۔''

اس آدمی نے جیب میں سے روپے نکالے۔ مرلی چاچا نے گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور مہوا کو اُس کے حوالے کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ 'چاچا، چاچا' پکارتی رہی مگر اُس کی آواز دنیا کے شور میں دب کر رہ گئی۔ چند سکّوں کی خاطر اُس کا بچپن، اُس کی معصومیت اور اُس کی عصمت بازار میں نیلام ہوگئی۔ اُس کلی کو پھول بننے سے پہلے ہی نوچ ڈالا۔ اُس کا جسم ہی نہیں اُس کی روح تک چھلنی ہوگئی۔ ماں کا آنچل اُسے پکارتا رہا اور وہ بابا کے سائے کے لیے تڑپتی رہی۔ پنجرے میں قید بلبل کی طرح آزادی کے لیے کسمساتی رہی، پھڑ پھڑاتی رہی۔ چند مہینے اُس دوزخ میں جلنے کے بعد ایک روز وہ اُس پنجرے کو توڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ اور ٹھوکریں کھاتے کھاتے وہ آخر کار آشرم کی محفوظ پناہ میں پہنچا دی گئی۔ بھلا ہو اُس کی بدحالی دیکھ کر اُسے صحیح ٹھکانے پر پہنچانے والے کا۔

نانی کا گھر یہ آشرم ہی تھا اور ان بچوں کے سوا دنیا میں ان کا بھی کوئی نہیں تھا۔ بچے نہ صرف ان کی عزّت کرتے تھے بلکہ اُن سے محبت اور دلار بٹورتے اور اُنھیں پیار دیتے۔ نانی کو بھی بچوں کے دکھ تکلیف کی خبر ہوتی اور فکر بھی۔ اُن کی کوشش ہوتی کہ جو بچّے اپنے ماں باپ سے بچھڑ چکے ہیں انھیں این جی او کی مدد سے اُن کے ماں باپ سے ملایا جائے اور یہی کوشش وہ مہوا کے لیے بھی کر رہی تھیں۔ جب مہوا آشرم میں آئی تھی تو نانی نے پیار سے 'دُلار'

سے پچکار کر سب کچھ اُگلوالیا تھا اور اُس کا درد اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ اُسے دوسرے بچوں کے ساتھ پڑھنے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا اور ڈھیرے ڈھیرے کتابوں سے اُس کی دوستی کروادی تھی۔

شام کے وقت وہ اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ آشرم کے لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ دفتر کی کھڑکی سے نانی نے جھانک کر دیکھا اور اُسے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ بھی آواز سنتے ہی اُٹھ کر اُن کے کمرے کی طرف بھاگی۔

''جی نانی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے کہا۔

''مہوا! اگر میں یہ کہوں کہ تمھارے بابا دو روز میں تمھیں لینے آرہے ہیں تو تم کیا کہوگی؟''

''سچ!'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ پہلے ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا اور پھر آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

نانی اٹھ کر اُس کے پاس گئیں اور اسے سینے سے لگا کر چپ کرایا۔ ''اگر یہ خوشی کے آنسو ہیں تو انھیں بہہ جانے دو۔ بہت کم بچّے اتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو کچھ بھی اتا پتا معلوم نہیں ہوتا اور وہ اتنی بڑی دنیا میں اپنے گھر، اپنوں کے بیچ پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تم جانتی ہو یہ کام کس نے اور کیسے کیا ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''جو یوگیش انکل آتے ہیں نا تم لوگوں سے ملنے، ان کے بہت سے ساتھی ہیں جو اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کھوئے ہوئے بچوں کو اُن کے گھر پہنچانے میں جی جان ایک کر دیتے ہیں۔ پچھلے چار سال سے اس کام میں لگے تھے اور اب جا کر انھیں کامیابی ملی۔''

''میرا گھر کہاں ہے نانی؟ میرے بابا میری ماں کیسی ہیں؟''

''تم جس ندی کی بات کرتی تھیں، جو رام جی کے شہر کے پاس ہے، وہ سریُو ندی ہے جو رام جی کے شہر ایودھیا کے پاس بہتی ہے اور آس پاس کے کئی گاؤں پھرنے کے بعد، لوگوں سے ملنے کے بعد تمھارے بابا رام دُلار کا پتہ چلا۔ چھوٹا سا ایک گاؤں ہے مانڈو، وہیں پر تمھارا گھر ہے۔ تمھیں تو اپنے بابا کے نام کے علاوہ کچھ یاد نہیں تھا۔ کیا اپنے ماں بابا

کی شکل یاد ہے یا وہ بھی نہیں؟ پہچان لوگی نا اُنھیں؟''

''کیسی بات کرتی ہیں نانی۔ اپنے ماں بابا کی شکل میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ اُن کو تو میں لاکھوں میں بھی پہچان لوں۔''

''تو بس اب تم تیاری کرلو اپنے گھر جانے کی۔ ہوسکتا ہے وہاں جاکر تمھیں لوگوں کی باتیں سننی پڑیں مگر تم چپ چاپ سن لینا کسی کو کچھ مت کہنا اور نہ ہی اُن صفحوں کا ذکر کسی سے کرنا جنھیں تم پھاڑ کر کہیں دُور پھینک آئی ہو۔ ہم سب تمھارے اپنے ہیں۔ یہ گھر بھی تمھارا ہے، جب دل اُداس ہو فون پر بات کرلینا یا خط لکھ دینا۔ کوئی مشکل آن پڑے تو یاد رکھنا تمھاری نانی ابھی زندہ ہے۔ جاؤ جاکر تیاری کرو اپنے اچھے مستقبل کے لیے۔''

مہوا کے چہرے کی خوشی اور اُس کی آنکھوں سے جھلکتا پیار اور عقیدت کے جذبات نے نانی کی روح کو خوشی سے شرابور کردیا۔

دو دن بعد ہی رام دُلار اپنی بیٹی کو لینے آشرم پہنچ گیا۔ باپ بیٹی اس طرح ملے کہ آشرم کا کوئی بھی باشندہ آنکھیں نم کیے بنا نہ رہ سکا۔ سبھی اُس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور اُسی شام سب کو الوداع کہہ کے، یوگیش انکل کو تہہِ دل سے شکریہ ادا کرکے، نانی کو خط لکھنے کا وعدہ کرکے وہ بابا کے سنگ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔

پندرہ گھنٹے کے سفر میں مہوا نے پورے پانچ سال کے درد اور تکلیف کا حساب اپنے بابا کو دے دیا۔ شروع کے چند مہینوں کا عذاب وہ بیان نہ کرسکی اس فکر میں کہ کہیں وہ سب سن کر دل پر بوجھ نہ پڑ جائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ بابا پہلے سے کہیں زیادہ کمزور ہوگئے ہیں۔ اُن کے چہرے پر رونق کی بجائے لاچاری، مجبوری اور بے کسی صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اُس کا درد سینے میں ضبط کرنے کے بعد جب انھوں نے اپنے سینے کے داغ اُسے دکھائے تو وہ تڑپ اٹھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اتنے دنوں سے جو اپنے گھر کے خواب وہ آنکھوں میں سجا کر لوٹ رہی ہے وہ ہمیشہ ادھورے ہی رہیں گے۔ بابا نے اُسے بتایا کہ:

''تمھارے کھو جانے کے بعد ہم لوگ دیوانوں کی طرح تمھیں ڈھونڈتے رہے۔ جگہ جگہ تلاش کیا۔ کوئی پیر فقیر، کوئی پنڈت کچھ بھی نہیں چھوڑا جو جس جگہ کہتا تھا اُسی طرف بھاگتے

تھے۔ پھر ایک روز مجھے گاؤں کے کسی آدمی نے بتایا کہ کسی نے تمھیں مرلی کے ساتھ اسٹیشن پر دیکھا تھا اور مجھے یکلخت خیال آیا کہ جب سے تم لا پتہ ہو مُرلی میرے پاس تقاضا کرنے نہیں آیا۔ مُرلی کو ڈھونڈا تو پتہ چلا وہ کئی دنوں سے گاؤں میں نہیں ہے اور جب وہ دس پندرہ روز بعد گاؤں لوٹا تو میں نے اُسے گھیر لیا۔ اُس وقت وہ نشے میں چور تھا اور مجھے ہی آنکھیں دکھانے لگا جب میں نے بھی غصّے سے گریبان پکڑ لیا تو چلاّ اٹھا کہ 'میں نے اپنا قرض وصول کرلیا ہے تمھاری بیٹی کو بیچ دیا'۔ یہ سنتے ہی مجھے غش آ گیا اور میں وہیں گر گیا۔ لوگ مجھے گرتا دیکھ میری طرف لپکے اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ جب تمھاری ماں کو سارا قصّہ سُنایا تو وہ غصّے سے پاگل ہو اُٹھی۔ مگر میری بگڑی حالت دیکھ وہ خاموش رہی۔ غصّے کی جوالا اُس کے سینے میں دہکتی رہی وہ رات قہر بن کر ٹوٹی۔ نہ جانے روتے روتے رات کے کس پہر آنکھ لگ گئی۔ صبح جب اُٹھ کر دیکھا تو تمھاری ماں وہاں نہیں تھی۔ آس پاس کے چند لوگ ساتھ ہو لیے اور اُسے ڈھونڈنے نکل پڑے۔ ابھی اُسے ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ کچھ لوگ بھاگے بھاگے آئے اور بتایا کہ کنوئیں میں ایک عورت کی لاش تیر رہی ہے۔ جب تک میں وہاں پہنچا لوگ اسے نکال چکے تھے اور جس کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا۔ تمھاری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی اور اُس نے اپنی جان دے دی مگر وہ ایسے ہی نہیں مری۔ کچھ دیر بعد میں پتہ چلا کہ مرنے سے پہلے اُس نے مُرلی سے بدلہ لے لیا ہے۔

''جب میں سو رہا تھا وہ رات کے اندھیرے میں اُٹھی اور میری درانتی لے کر مُرلی کے گھر پہنچ گئی جو شراب کے نشے میں چور آرام کی نیند سو رہا تھا۔ اُس نے جاتے ہی اُس کا گلا کاٹ دیا۔ درانتی وہیں پھینکی اور کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔'' رام دُلار کی آواز بولتے بولتے ڈوب گئی اور مہوا کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی۔ یہ خبر اُس پر بجلی کی طرح گری تھی۔ اگلی خبر اُس سے بھی زیادہ خطرناک تھی جب اُسے گھر کے پاس جا کر یہ بتایا گیا کہ اب گھر میں اُس کی نئی ماں انتظار کر رہی ہے۔

پانچ سال میں سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ ہی وہ گھر تھا جس میں ماں کا پیار مہکتا تھا، نہ وہ تلسی کا آنگن تھا نہ وہ ساتھی نظر آئے۔ لوگ اس سے کتراتے تھے جیسے اُسے چھوت کی بیماری

ہوگئی ہو۔ کھوئی ہوئی جنّت کے خواب اور اسے واپس پا لینے کی خوشی وہم سے زیادہ نہ نکلی۔ وہ تو اپنے گھر، اپنے گاؤں اپنے لوگوں میں واپس آئی تھی دل میں یہ ارمان لیے کہ سب اُسے دوبارہ پا کر خوش ہوں گے، اُس کے زخموں پر پیار کا مرہم رکھیں گے اور وہ دھیرے دھیرے اُس درد کو بُرا خواب سمجھ کر بھول جائے گی۔ گھر سوتیلی ماں اور اُس کے دو سال کے بیٹے کا ہو چکا تھا۔ اُس کے بابا بھی اب اُس کے نہیں رہے۔ پہلے دن ہی اُسے دیکھتے ہی اُس کی ماں کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے اور چار دنوں بعد اُس کی ماں ایسے نشتر چبھانے لگی تھی کہ سیدھے اُس کے دل پر لگتے۔ بابا سے کچھ کہتی کیسے، اُنھوں نے اپنی زبان، آنکھیں اور کان بند کر لیے تھے۔ گھر سے باہر نکلتی تو منچلے، آوارہ لڑکے اُسے دیکھ کر گندے گندے اشارے کرتے اور ایسی پھبتیاں کستے جو گرم سیسے کی طرح اُس کے کانوں میں پگھلتی۔

ایک روز اُسے اچانک بلبل مل گئی جب اُس نے بلانے کی کوشش کی تو اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا: 'ہم تمھیں نہیں جانتے بچپن کی بات اور تھی۔ ہمیں تم سے بات کرنے کو منع کیا گیا ہے'۔ بچپن میں ماں کی سہیلیوں کو جنھیں وہ موسی، چاچی کہا کرتی تھی وہی اُسے بلا بلا کر چٹخارے لے لے کر ایسی ایسی باتیں پوچھتی تھیں کہ: 'کتنے مردوں کے بستر گرم کر چکی ہو؟ بہت ستاتے تو نہیں تھے تمھیں؟ کتنی کتنی عمر کے مردوں کو خوش کر چکی ہو؟ کیا تجھے گود میں....؟' اور نہ جانے کیا کیا۔ جملے سن کر اُس کا خون کھول جاتا اور وہ چپ چاپ روتی روتی نئے زخم لیے گھر لوٹ آتی۔ اُس نے گھر سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا تھا۔ بات کرے تو کس سے، اپنا دُکھ درد سنائے تو کسے، کوئی ہمدرد نہ تھا۔ اُسے آشرم کے ساتھی یاد آتے، نانی کا پیار یاد آتا اور وہ اٹھتی اور اُنھیں خط میں سب بیان کر دیتی اور وہ ڈاک میں نہ بھیج کر اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔ اُمید کی ایک کرن ہمیشہ جلائے رکھتی کہ ایک روز تو اس کے دن بدلیں گے۔

کل رات تو ساری اُمیدیں ہی ختم ہوگئیں جب اُس نے ماں کی طعنہ زنی سے پریشان ہو کر اکیلے میں اپنی تکلیف بابا کو بتانی چاہی تو انھوں نے اُس کی ایک نہ سنی اور غصّے میں اس پر برس پڑے۔

''مہوا! تیری وجہ سے ہمارا گاؤں میں جینا محال ہوگیا ہے۔ سوچا تھا تیرے ہاتھ پیلے

کر دوں مگر جس جگہ بھی بات کرتا ہوں تیری رُسوائی کے قصّے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ گاؤں والے تو پہلے ہی تجھے واپس لانے کے خلاف تھے۔ پنچایت کے آگے ہاتھ جوڑے، منتیں کیں تو وہ راضی ہوئے۔ اب سوچتا ہوں وہ ٹھیک تھے میں ہی غلط تھا۔ تو چلی گئی تھی تو رو دھو کر صبر کر لیا تھا مگر تو واپس کیا آئی ہمارا جینا حرام ہو گیا۔ نہ گھر میں چین نہ باہر سکون۔ گاؤں میں بہت سے کنؤیں ہیں جو تجھے دکھائی نہیں دیتے؟

''مگر بابا میرا قصور کیا ہے؟''

''قصور تیرا نہیں، میرا ہے جو میں تیرا باپ ہوں۔ بس معاف کر دے ہمیں۔'' دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑے اور غصّے سے پیر پٹکتے باہر نکل گیا۔

وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ یہ شخص اُس کے بابا نہیں ہو سکتے۔ شاید ماں اُس کے بابا کو بھی ساتھ لے گئی۔ یہ تو سوتیلی ماں کے پتی ہیں۔

رات بھر وہ سو نہیں سکی۔ وہ روئی بھی نہیں۔ یہی سوچتی رہی کہ گاؤں کے کنؤیں بہت پاس ہیں اُس کی ماں بھی وہیں سو رہی ہیں وہ بھی اُن کے پہلو میں جا کر سو جائے تو شاید اُسے بھی سکون مل جائے اور پھر نانی کا آشرم یاد آیا مگر وہ بہت دُور میلوں دُور جدھر اکیلے پہنچنا آسان نہیں۔ اب دو ہی راستے ہیں وہ کدھر جائے؟ اُسی کشمکش میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے جب ساری دُنیا آرام سے سوئی تھی اُس نے گھر سے باہر قدم نکالا اور سیدھے اُس کنؤیں کی طرف چل دی جدھر اُس کی ماں کے آخری قدم پڑے تھے۔ کنؤیں کے پاس رُکی، جھانک کر کنؤیں میں دیکھا پھر بند مٹھی کھولی اُس میں بابا کے چرائے ہوئے نوٹ تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے کنؤیں کو دیکھنے کے بعد سیدھی شہر جانے والی پکّی سڑک کی جانب ڈگ بھرنے لگی۔ اُس کی چال میں بلا کا اعتماد، جینے کی تمنا اور مقابلہ کرنے کا عزم نمایاں تھا!

OO

دیمک

ملہار گاؤں سے میرا رشتہ ویسے بھی ہے اور ویسا بھی۔ یعنی ننھیال وہاں ہے اس لیے رشتہ گہرا ہے اور بچپن کی یادیں اس سے جڑی ہیں اس لیے رشتہ جذباتی بھی ہے۔ بچپن کی سنہری یادیں اسی مٹّی سے جڑی ہیں۔ میری چھٹیاں وہاں کے کھیت کھلیانوں، کچی دُھول بھری سڑکوں، پگڈنڈیوں پر بھاگتے دوڑتے پھل سے لدے درختوں پر چڑھتے اترتے اور کبھی گرمی سے نجات پانے کے لیے ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی میں ایک دوسرے کو بھگو کر نہاتے اور کبھی دیر شام تک پیپل کے پیڑ تلے بیٹھ کر بھوت جن کی ڈراؤنی کہانیاں سنتے سناتے گزرتی۔ گرمیوں کی ڈیڑھ مہینے کی چھٹی ہوتی تو میری کوشش یہی ہوتی کہ میں پہلی چھٹّی میں ہی گاؤں پہنچ جاؤں۔ وہاں میرے ہم عمر ماموں زاد بھائی اور ان کے دوستوں کے ٹولے کو بھی میری ان چھٹیوں کا انتظار ہوتا۔ بچپن کی شرارتیں، مستی، بے فکری یہ ہی تو زندگی کے اس حصے کو سب سے سنہرا، سب سے زیادہ یادگار بنا دیتے ہیں۔ دس جماعت پاس کی تو پڑھائی کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ذمّے داریاں بڑھیں تو دھیرے دھیرے ملہار کا ساتھ چھوٹتا گیا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب سال میں صرف دو یا تین دن سے زیادہ وقت گزارنے کا وہاں موقع نہ ملا۔ موج مستی کا وقت گزر گیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ ان لوگوں کی زندگی کتنی دشواریوں سے بھری ہوئی ہے۔ چند گھنٹوں میں کئی میلوں کا سفر طے کرتے ہی نہ صرف ماحول اور فضا بدل جاتی ہے بلکہ زندگی ہی مختلف ہو جاتی ہے۔ شہروں میں بجلی، پانی، اسکول، ڈاکٹر، بسیں، کار، زندگی کو کتنا آسان اور خوشحال بنا دیتے ہیں اور گاؤں کے لوگ سارا دن کی جی توڑ محنت کے بعد بھی ان سہولتوں سے محروم رہتے ہیں۔ جو گاؤں سے ایک بار شہر چلا گیا پھر وہ دوبارہ وہاں نہیں آتا۔ جنم گاؤں میں لیتے ہیں پڑھتے شہروں میں ہیں اور پھر گاؤں کو

بھول کر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وقت کے ساتھ گاؤں والوں میں بھی بیداری پیدا ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی اپنے جائز حقوق کے لیے آواز بلند کی تھی اور اسی گاؤں والوں کے تعاون سے چودھری بلونت سنگھ الیکشن جیت گیا تھا۔ ایم ایل اے بنتے ہی اس نے گاؤں والوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس جیت کا قرض ضرور چکائے گا۔ تین سال بیت گئے مگر گاؤں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی البتہ چودھری بلونت سنگھ کا چھوٹا سا مکان ایک بڑی کوٹھی میں تبدیل ہو گیا۔ ٹوٹے پرانے اسکوٹر کی جگہ ایک چمچماتی نئی بڑی گاڑی وردی والے ڈرائیور کے ساتھ گھر کے پورچ میں ضرور دکھائی دینے لگی۔ گاؤں کے بچے دُور سے ہی دیکھ کر اسے خوش ہو جاتے۔ بچوں کی ٹولیاں صرف گاڑی دیکھنے کے لیے ان کے گھر کے باہر جمع ہو جاتیں اور جب دھول اُڑاتی گاڑی گاؤں سے نکلتی تو پاگل کتوں کی طرح بچے بھی ننگے پاؤں گاڑی کے پیچھے دوڑتے۔ ایک بار اسے چھونے کی چاہ میں وہ اپنا دم پھلا لیتے۔ اب ایم ایل اے صاحب سے ملاقات گاؤں والوں کی کم ہی ہوتی۔ ان سے ملنے ملانے سے لے کر دوسرے کاموں تک کو ان کا سکریٹری اشوک کمار پنڈت ہی دیکھتا۔

پچھلے کئی دنوں سے بڑے ماموں کی طبیعت ناساز تھی۔ گاؤں میں نہ اچھا ڈاکٹر نہ کوئی اسپتال اور جب مجھے خبر ملی تو میں نے دفتر سے دو دن کی چھٹی لے لی اور انھیں اپنے ساتھ شہر لانے کا ارادہ کر لیا۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک اچھے ڈاکٹر چوبیس گھنٹے موجود ہیں۔

گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی لوگوں کی گہما گہمی دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ پچھلے دس دنوں سے گاؤں میں ہونے والے جلسے کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ گلی کے نکڑ تک ہی پہنچا تھا کہ فراز کے بچوں نے دیکھ لیا اور شور مچاتے میرے پاس دوڑے چلے آئے۔ ایک چھوٹا سا بیگ ہی تھا میرے ہاتھ میں وہ پکڑ لیا اور گھر کی طرف بھاگ گئے۔ میرے داخل ہونے سے پہلے میرے آنے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ دالان میں بڑے سے تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لیے ماموں لیٹے تھے اور آس پاس تین چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ میں بھی چھوٹے بچے کی طرح ان بانہوں میں لپک کر سمٹ گیا۔ ایسے لگا میں ماں کے سینے سے لپٹا ہوں۔ ایک عرصے سے ماں کے لمس سے محروم

ہو چکا ہوں مگر آج بھی اس لمس کا جادو تازہ ہے۔ نہ جانے یہ ڈھلتی عمر کا اثر تھا یا بیماری کا، ماموں کافی دُبلے ہو گئے تھے۔ چوڑا سینہ اور فولاد کی طرح دِکھنے والے کاندھے اب اندر کی طرف جُھک گئے تھے۔ لب ہلے تو معلوم ہوا کہ آواز میں اب بھی وہ رعب اور دم باقی ہے۔ سب کا حال چال دریافت کرنے کے بعد میں نے اپنے آنے کا سبب بتایا تو ایک کھوکھلی سی ہنسی ان کے جھرّیوں بھرے چہرے پر پھیل گئی۔

''جب خزاں کا موسم آجائے تو سوکھے پتوں کا جھڑنا لازمی ہے۔ انھیں کب تک بچا کر رکھوگے۔''

''جب تک دم میں دم ہے۔''

''فراز کھیتوں پر گیا ہے کیا؟'' گھر میں سب سے مل لینے کے بعد جب مجھے بھائی نظر نہیں آیا تو پوچھ لیا۔

''تم نے دیکھا ہوگا گاؤں میں کتنی ہلچل ہے۔''

''راستے میں ہی معلوم ہوا ہے کہ کسی جلسے کی تیاری چل رہی ہے۔ کیسا جلسہ ہے یہ؟''

''میگھ سنگھ کو تو تم جانتے ہی ہو۔ جب سے سرپنچ بنا ہے گاؤں کی ترقی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ جس دن سے ایم ایل اے صاحب کے سکریٹری اشوک کمار پنڈت نے یہ خبر سنائی ہے کہ سرکار نے ایک کروڑ روپۓ کی گرانٹ گاؤں کی ترقی کے لیے جاری کردی ہے، خوشی اور جوش کی لہر گاؤں والوں میں دوڑ گئی ہے۔ باشندوں کی معصوم آنکھوں میں سنہرے خواب مچلنے لگے ہیں۔''

''چلو گرانٹ ملے گی تو اس گاؤں کا بھی سُدھار ہوگا ورنہ۔''

''گرانٹ تو ملے گی ہی۔ سرکار نے گرانٹ منظور کرتے ہوئے یہ سخت ہدایت کی ہے کہ گرانٹ کا چیک پورے گاؤں کے سامنے سرپنچ کو اس علاقے کا ایم ایل اے تھمائے گا۔ ایک مدّت کے بعد سوئی ہوئی سرکار کی آنکھ کُھلی ہے۔ اس گاؤں کے بھاگ بھی جاگے ہیں۔''

''اب سمجھ میں آیا لوگوں میں اتنا جوش کیوں ہے۔''

''میگھ سنگھ بہت سمجھ دار ہے۔ اس نے نہ صرف پنچوں کو بلکہ دوسرے معتبر باشندوں اور بزرگوں کو بھی اس مہم میں شامل کرلیا ہے۔ ایک بیٹھک میں سب کی رضامندی سے ایک

تجویز تیار کر لی ہے جس میں یہ طے پایا ہے کہ پکی سڑکوں پر، اسکول، اسپتال، بجلی، پانی وغیرہ پر کتنا کتنا خرچ کرنا ہے۔ سالوں سے جن سہولتوں سے محروم رہے ہیں اب وہ سب مہیا کرادی جائیں گی۔''

''یہ جلسہ ہے کب؟''

''کل صبح گیارہ بجے۔ میں بھی اس میں شریک ہونا چاہتا ہوں مگر تمھارا بھائی اس کے لیے راضی نہیں ہے۔''

''آپ کو بالکل نہیں جانا چاہیے۔ آپ کی جگہ میں چلا جاؤں گا اور آ کر آنکھوں دیکھا حال بیان کردوں گا۔''

''بھائی کیوں مجھے درتر اشٹ بنا رہے ہو؟''

''تو کیا ہوا؟ میں بھی تو سنجے بن رہا ہوں۔''

گاؤں کے سبھی چھوٹے بڑے بچّے، نوجوان، بزرگ، عورتیں اور لڑکیاں صبح صبح تیار ہو کر جلسے میں شریک ہونے پنڈال کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ تیار تو ایسے ہوئے تھے کہ کوئی تہوار ہو یا میلا دیکھنے جا رہے ہوں۔ پہلی بار گاؤں میں سرکاری افسر اور سیاسی لیڈر گاؤں کی شان بڑھانے آ رہے تھے۔ پنڈال کو رنگ برنگی کاغذ کی جھنڈیوں سے اور گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر موٹے موٹے حرفوں میں ایم ایل اے صاحب کے لیے خوش آمدید کے اشتہار لگائے گئے تھے۔ لوگ بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ فوٹو گرافر، پریس رپورٹر سبھی خاص مہمانوں کے منتظر تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کچی سڑکوں پر بھاگتی گاڑیوں سے اُڑتی دھول نے مہمانوں کی آمد کا اعلان کر دیا۔ پانچ چھ گاڑیاں ایک ساتھ آ کر رُکیں اور پھر ایم ایل اے صاحب سرکاری افسروں اور دوسرے سیاسی لیڈروں کو ساتھ لیے آگے بڑھنے لگے۔ ساتھ چلتے چمچوں کی فوج بھیڑ کو تتر بتر کرتی راستہ بناتے ہوئے انھیں اسٹیج کی طرف لے گئی۔ پھولوں کے ہاروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ پھر ایم ایل اے صاحب نے تقریر شروع کی تو پہلے سرکار پھر سیاسی پارٹی کے لیڈروں اور پھر اپنی کامیابی کے جم کر پل باندھے۔ چمچوں کے پیچھے پیچھے لوگوں نے بھی تالیاں بجا کر پنڈال

سر پر اٹھالیا۔ آخر میں سرپنچ صاحب کو بلایا گیا اور انھیں ایک کروڑ روپے کا چیک سرکاری افسروں کی موجودگی میں تھما دیا گیا۔ فوٹو گرافر کھٹاک کھٹاک فوٹو اُتارتے گئے اور پورا پنڈال تالیوں اور 'ایم ایل اے صاحب زندہ باد' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ سرپنچ کی آنکھوں کی چمک اس کی خوشی کی گواہی دے رہی تھی۔ چیک لینے کے بعد اس نے پورے گاؤں والوں کی طرف سے ایم ایل اے صاحب اور سرکاری نمائندوں کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور جس تیزی سے قافلہ آیا تھا اسی تیزی سے وہاں سے چلا بھی گیا۔ سبھی ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ چلے۔ سرپنچ بھی لوگوں میں گھرا ہوا تھا کہ اشوک کمار پنڈت نے گرم جوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

''اب تو خوش ہو میگھ سنگھ جی؟''

''سب آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔ دیکھنا گاؤں والے کتنی دُعائیں دیں گے آپ کو۔''

''بھائی ایم ایل اے صاحب تو سب کا خیال رکھتے ہیں پھر یہ تو ان کا اپنا گاؤں ہے۔''

''یہ تو آپ نے درست کہا۔''

''ایک بار جھلک تو دکھا دو۔ ہم بھی تو دیکھیں کیسے ہوتے ہیں ایک کروڑ روپے۔''

میگھ سنگھ نے جیب میں سے چیک نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اشوک کمار پنڈت نے دونوں ہاتھوں سے چیک تھاما، اسے پڑھا اور پھر چیک اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میگھ سنگھ حیرانگی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

''آپ نے چیک غلطی سے اپنی جیب میں ڈال لیا۔''

''بھائی میگھ سنگھ لین دین کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ابھی تم ناواقف ہو اس روایت سے۔ کل صبح ایم ایل اے صاحب کی کوٹھی پہنچ جانا۔ اس میں سے کس کس کا کتنا حصہ ہے یہ بتا دیں گے۔ اب تم آرام سے گھر جاؤ۔''

میگھ سنگھ بت بنا دیکھتا ہی رہ گیا اور میں یہ منظر دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ سیاست کے داؤ پیچ یہ معصوم لوگ کیا جانیں۔ یہ لوگ فصلوں کو کھاتی دیمک کو ہی پہچان سکتے ہیں۔

OO

تہذیب کے دوراہے پر

چنڈی گڑھ میں پاؤں رکھتے ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی جنت میں آ گئی ہو۔ کہاں چندن پور کی چھوٹی چھوٹی دُھول بھری گلیاں اور کہاں چنڈی گڑھ کی صاف ستھری چوڑی چوڑی سڑکیں جن کے دونوں جانب ہرے ہرے پھولوں سے لدے گھنی چھاؤں دیتے درخت۔ ایک جیسی عمارتیں، ایک جیسے مکان، خوبصورت عالی شان کوٹھیاں اور سڑکوں پر دوڑتی بڑی بڑی گاڑیاں۔ اس کے شوہر کا تبادلہ چھ مہینے پہلے ہی چنڈی گڑھ ہوا تھا۔ پراگ دَت سرکاری ملازم تھے، وقت پر جانا ضروری تھا۔ لہٰذا لتا کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر چلے آئے تھے جلد ہی مناسب گھر کا انتظام کر کے اسے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا جسے پورا کرتے کرتے انھیں چھ ماہ لگ گئے۔ شہر میں آتے ہی انھوں نے اپنے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی تھی، خود وہ کسی کے یہاں پینگ گیسٹ بن کر رہ رہے تھے۔ کھانا پینا سب وقت پر مل جاتا۔ کپڑے بھی دُھلے دُھلائے مل جاتے بس دقت صرف اتنی تھی کہ کمرے میں تین لڑکے اور رہ رہے تھے اور ان کے آنے اور سونے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ جیسے تیسے پریشانی میں رات کاٹتے اور جلد ہی اپنے لیے مکان تلاش کرنے کی جدوجہد میں لگ جاتے۔ جو مکان پسند آتا اس کا کرایہ ان کی پہنچ سے باہر ہوتا، کبھی انھیں علاقہ پسند نہیں آتا تو کبھی لوگ۔ اتنے دنوں کی دوڑ دُھوپ کے بعد انھیں اس پوش علاقے میں دوسری منزل پر ایک کمرا اور ایک رسوئی کرائے پر ملی تھی۔ مکان ملتے ہی وہ بیوی کو لینے چندنپور پہنچ گئے تھے۔

لتا ایک پڑھی لکھی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی تھی۔ یو پی کے ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی اور وہیں ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کر لی۔ بچپن

سے ارمان تھا کہ کسی بڑے سے شہر میں جا کر پڑھے، نوکری کرے مگر ان کے خاندان اور چندن پور میں کنواری لڑکیوں کو اکیلے باہر بھیجنے کا رواج ہی نہ تھا، پھر اس کا یہ سپنا کیسے پورا ہوتا۔ ایک امید بچی تھی کہ شاید شادی بڑے شہر میں ہو جائے، وہ بھی پراگ دت سے رشتے کے بعد ختم ہو گئی۔ اس کا سسرال بھی چندن پور جیسا ہی تنگ گلیوں، کچّی سڑکوں والا تھا۔ شادی کے بعد تو اس کی نوکری بھی چھوٹ گئی تھی۔ اس نے ایک دوبار نوکری کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سسُر کا رُعب دار جواب سننے کو مل گیا۔

''ہمارے یہاں بہوؤں کو نوکری پر بھیجنے کا رواج نہیں ہے۔ یہ تمھارے میکے میں ہوتا ہوگا، یہاں نہیں۔''

ٹکا سا جواب سن کر وہ من مسوس کر رہ گئی۔ ہر لڑکی کی طرح اس کا بھی یہ ارمان تھا کہ وہ اپنے پتی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت اکیلے بتائے مگر سسرال میں اتنا بڑا کنبہ کہ دن میں دو منٹ بھی اکیلے بات کرنے کا نہ موقع ملتا اور نہ ہی وقت۔ صبح اندھیرے مُنہ اٹھنا پڑتا اور سارا دن سر پر پلّو ڈال کر گھر کے کام کاج میں ہی گزر جاتا۔ گھر پر سبھی اچھے تھے مگر شادی کے تین سال بعد بھی گود سونی ہونے کی وجہ سے اسے ہی قصوروار سمجھا جاتا۔ باہر کی عورتیں اسے عجیب نظروں سے دیکھتیں اور موقع ملتے ہی پھبتی کسنے سے گریز نہ کرتیں۔ لوگوں کی باتیں اور زندگی میں اس محرومی کی وجہ سے وہ اپنی جھنجھلاہٹ اور غصّہ اپنے پتی پر ہی اُتارتی۔ پہلے غصّہ کرتی پھر لڑائی کرتی اور آخر میں رونا شروع کر دیتی۔ پراگ دَت بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھتا۔ ایک روز ایسے ہی حالات سے دو چار ہو کر اس نے اپنے دوست سے صلاح مشورہ کیا اور کسی جان پہچان والے لیڈر سے سفارش کروا ڈالی۔ چند ہی دنوں میں تبادلے کے آرڈر اس کے ہاتھ میں تھے۔ تبادلے کی خبر سن کر لتا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کی آنکھوں نے دن میں بھی سپنے دیکھنے شروع کر دِیے۔ کھوئے ہوئے خواب پھر لوٹ آئے۔ دبے ہوئے ارمانوں نے ایک بار پھر دل پر دستک دینی شروع کر دی۔ اب شہر میں اس کا اچھی طرح علاج ہو سکے گا۔ اسے اپنے وجود میں بچے کی کلکاریاں سنائی دینے لگیں۔

شہر کی چہل پہل اور رنگین فضا اسے بڑی دلکش لگی۔ اپنے پیا کے سنگ اپنے نئے گھر

میں پہنچ کر اس نے سکھ کی سانس لی۔ گھر کے نام پر مکان کی دوسری منزل پر ایک بڑا سا کمرا اور اس کے ساتھ بنا ایک چھوٹا سا اسٹور جسے رسوئی کا نام دے دیا تھا۔ اب یہ ہی اس کی دُنیا تھی۔ گھر دکھاتے ہوئے پراگ دت شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ پتی کی جھینپ کو مٹانے کے لیے وہ جھٹ سے بول پڑی: ''آپ کا ساتھ ہی کافی ہے۔ ہم اپنی اس چھوٹی سی دنیا کو بھی جنّت بنالیں گے۔''

''ایسے مکان کو ملنے میں چھ مہینے لگ گئے اور اگر یہ بھی نہ لیتا تو نہ جانے اور کتنا وقت ہمیں الگ الگ رہنا پڑتا۔'' اتنا کہہ کر انھوں نے اسے سینے سے لگالیا۔

سفر کی ساری تھکان پتی کی بانہوں میں سو کر غائب ہوگئی۔ نئی صبح سے نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ پراگ دت شام کو دفتر سے جلد لوٹنے کا وعدہ کر کے چلے گئے اور وہ سارا دن اپنے مکان کو گھر بنانے میں، اسے سجانے سنوارنے میں لگ گئی۔ کام سے فرصت ملی تو باہر بالکونی میں نکل کر آس پاس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر طرف لوگ اسے بھاگتے دوڑتے ہی نظر آئے۔ اس کا گھر جس بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا اس کے سب سے نیچے والے حصے میں مکان مالک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ پہلی منزل پر چار کمرے تھے اور ہر کمرے میں تین تین لڑکیاں الگ الگ شہروں سے یہاں پڑھنے آئی تھیں اور وہاں بطور پیئنگ گیسٹ رہ رہی تھیں۔ سب سے اوپر والی منزل میں دو بڑے کمرے تھے۔ سیڑھیوں کے اس طرف ان کا کمرا اور سیڑھیوں کے دوسری طرف والے کمرے میں دو لڑکے رہتے تھے، جو یہاں پڑھائی کرنے آئے تھے۔ لڑکیوں کو اوپر والی منزل پر آنا منع تھا اور لڑکوں کو بھی لڑکیوں کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

اس شام پراگ دَت دفتر سے جلدی لوٹ آئے اور بیوی کو شہر سے واقف کروانے لے گئے۔

سب سے پہلے وہ اسے گھر کے پاس والی مارکیٹ، جہاں ضرورت کا ہر سامان ملتا تھا لے گئے۔ پھر پارک کی اور بڑھ گئے۔ چندن پور میں ایسا پارک کہاں اور اگر ہوتا بھی تو وہ دونوں اکیلے کبھی وہاں گھومنے جا ہی نہیں سکتے تھے۔ پارک کی ہریالی اور پھولوں کی بہار دیکھ

کر اس کا دل خوش ہو گیا مگر دوسرے ہی پل سامنے کا نظارہ دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے پلٹنے لگی پراگ دَت نے اس کے بازوں کو تھام لیا۔

''گھبراؤ نہیں۔ یہ بات عام ہے، ایسے نظارے تمھیں ہر جگہ دیکھنے کو ملیں گے۔''

تھوڑی تھوڑی دُوری پر پیڑوں کے بیچوں بیچ نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح چپکے بیٹھے تھے کہ دیکھنے والوں کو شرم آ جائے۔ مگر وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے بے خبر شرم و حیا کو طاق پر رکھ کر ایسے چپک کر بیٹھے، اور اِک دوسرے میں سمانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

''ان کے ماں باپ کو علم نہیں کہ ان کے بچّے کیا گل کِھلا رہے ہیں۔''

''ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو اپنے گھروں سے دُور اس شہر میں پڑھنے یا نوکری کرنے آئے ہیں۔ کوئی کسی کو جانتا نہیں، کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ کسی کے پاس کسی کے لیے وقت بھی نہیں۔ کوئی پابندی نہیں، کوئی روک ٹوک نہیں۔ بس پوری آزادی۔''

''ہمارے وہاں تو ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں تو....''

''ہمارے وہاں کو چھوڑو اور یہاں کو دیکھو، اب تمھیں ایسی جگہ اس نئے ماحول میں رہنا ہے۔ شروع میں مجھے بھی عجیب لگتا تھا مگر اب عادت ہو گئی ہے۔ فکر مت کرو، تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔''

دھیرے دھیرے وہ بھی اس ماحول کی عادی ہو گئی۔ حالانکہ اسے اپنے چھوٹے شہر کے رسم و رواج، وہاں کی تہذیب، بڑوں کی آنکھوں کی شرم، اس خوبصورت شہر سے بہتر لگیں۔

شہر کی نامی ڈاکٹر آنچل گپتا سے لتا کا علاج شروع ہو گیا۔ ٹیسٹ کروائے گئے اور اس کی رپورٹ کے مطابق علاج شروع ہو گیا۔ ''کچھ دنوں بعد ہی بتایا جا سکے گا کہ علاج کامیاب ہو گا یا نہیں۔ اگر رپورٹ ٹھیک ہوئی تو بہت اچھے، ورنہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے طریقے بھی ہیں ماں بننے کے۔'' ڈاکٹر گپتا کی یہ بات سن کر لتا کا چہرہ اُتر گیا تھا۔

پراگ دَت صبح ہی دفتر چلے جاتے اور وہ جلد ہی کام سے فارغ ہو کر پتی کے آنے کا انتظار کرنے لگتی۔ اسے اب اپنے چندن پور کا بڑا سا لوگوں سے بھرا ہوا گھر یاد آنے لگا تھا۔

سارا دن کام میں کیسے بیت جاتا تھا اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا اور یہاں دو لوگوں میں کتنا کام ہوتا ہے اور وہ بھی ایک کمرے والے گھر میں؟ وہاں لوگ کتنے ملنسار ہیں ذرا سی کسی کو تکلیف ہو تو سب کام چھوڑ کر بھاگے چلے آتے ہیں۔ اور یہاں وہ کسی سے دو بول سانجھے کرنے کو ترس گئی۔ کسی پڑوسی کو اپنے پڑوسی کے بارے میں معلوم ہی نہیں۔ کوئی ساتھ والے کمرے میں مر رہا ہو کسی کو کچھ لینا دینا نہیں، کوئی کسی کے بارے میں نہیں سوچتا۔

ایک روز کام سے نپٹ کر وہ بیٹھی ہی تھی کہ اسے کسی لڑکی کے رونے کی اور بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔

پہلے تو وہ سنتی رہی پھر اسے لگا کوئی تکلیف میں ہے۔ آوازیں سامنے والے کمرے سے آ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو منٹ بعد لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر اس نے حیرانگی سے دیکھا۔

"بھائی صاحب مجھے لگتا ہے یہاں کوئی رو رہا تھا۔"

"رو رہا تھا؟ یہاں؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"آوازیں تو یہیں سے آ رہی تھیں؟"

"اوہ! وہ تو ٹی وی کی آواز تھی۔"

"اچھا....اچھا...." اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتی اس لڑکے نے دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔ سارا دن وہ خود کو کوستی رہی کہ اسے کیا ضرورت تھی اس جھمیلے میں پڑنے کی۔

ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ اس نے اس کمرے سے صبح سویرے ایک لڑکی کو نکلتے دیکھا۔ اس کا ماتھا پھر ٹھنک گیا۔

"سنو میں نے ساتھ والے کمرے سے ایک لڑکی کو جاتے دیکھا ہے۔"

"پھر؟"

"پھر لڑکوں کے کمرے میں لڑکی۔ کیا وہ رات بھر یہیں تھی؟"

"تمھیں کیا لینا۔ تم ان بیکار باتوں پر دھیان مت دیا کرو۔"

"سارا دن بے کار اکیلی بیٹھی رہتی ہوں۔ میرا کیا قصور ہے اگر ذہن اِدھر اُدھر بھاگتا

ہے۔ کیوں نہ میں کوئی کام کرلوں۔؟''

''سب سے بڑا کام تمھیں جو کرنا ہے وہ کر رہی ہو۔ تمھارا اچھی طرح علاج ہو جائے۔ ہمارے گھر کا سونا پن ختم ہو جائے تو تمھیں ان بیکار باتوں کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔''

پراگ دَت نے بیوی کی بوریت دُور کرنے کے لیے اسے ڈھیر ساری کتابیں لا کر دے دیں۔ ایک چھوٹا ٹی وی بھی لے آیا۔ اب وہ اپنا خالی وقت ٹی وی دیکھ کر یا بالکونی میں دُھوپ میں کتابیں پڑھ کر کاٹنے لگی۔ اب وہ آس پاس والے لوگوں کو پہچاننے لگی تھی۔ پہلی منزل والی لڑکیوں کے کالج آنے جانے کے وقت سے بھی واقف ہوگئی تھی۔ شام کو وہ لڑکیاں کبھی اکیلی یا کبھی کسی دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھومنے نکلتیں تو وہ بڑی حسرت سے ان لڑکیوں کو ملی آزادی کو دیکھتی۔ ان کے وہاں تو لڑکیاں اکیلے شام ڈھلے گھر سے باہر نکل بھی نہیں سکتی تھیں۔ اگر کبھی اچانک کوئی جان پہچان والا لڑکا سڑک پر مل گیا اور کسی لڑکی کو اس سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو سمجھو اس کی شامت آئی۔ کتنا ارمان تھا اسے اس طرح آزاد گھومنے اور ہاسٹل میں پڑھنے کا۔ اسے لڑکیوں کی یہ آزادی بہت لبھا رہی تھی۔ من ہی من سوچنے لگی کاش وہ بھی اس ماحول میں پلی بڑھی ہوتی۔ شاید اس کی آنے والی نسل اس ماحول میں آنکھیں کھولے یہ ہی سوچ کر اسے تسلّی ہو جاتی۔

ڈاکٹر گپتا کے پاس لے جانے کے لیے پراگ دَت نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ وہاں پہنچے تو مریضوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ کئی وہاں اپنی قسمت آزمانے آئے ہوئے تھے تو کئی ایسے تھے جن کا دامن خوشیوں سے بھرنے والا تھا۔ بڑھے ہوئے پیٹ والی عورتوں کو وہ بڑی حسرت سے دیکھتی رہی۔ جب ڈاکٹر کے کمرے میں وہ داخل ہوئی تو چونک گئی۔ ڈاکٹر جس مریض کو آپریشن تھیٹر میں حمل گرانے کے لے جانے کو کہہ رہی تھی وہ وہی لڑکی تھی جسے اس روز اس نے سامنے والے کمرے سے صبح سویرے نکلتے دیکھا تھا اور جو لڑکا فارم بھر رہا تھا وہ سامنے کے کمرے والا تھا جس نے دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا تھا۔ دونوں پینگ گیسٹ اپنے گھر والوں سے دُور آزادی کا جشن اس طرح منا رہے تھے۔

OO

بس ایک لمحہ

ندی اگر اُفان پر آ جائے تو باندھ لگانا لازمی ہو جاتا ہے ورنہ تیز بہتا پانی نہ جانے کہاں کہاں سے تباہی مچاتا ہوا اپنا راستہ تلاش کرتا آگے نکل جاتا ہے۔ یہی سوچا تھا پرکاش بجاج نے اپنی اٹھارہ سال کی بیٹی کو بیاہنے سے پہلے۔ جس دن سے اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، ماں باپ کا دِن کا چین اور راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ متوسط طبقے کے لوگ عزّت بچانے کی فراق میں گھلتے رہتے ہیں ورنہ نہ اعلیٰ طبقے اور نہ نیچے طبقے کے لوگ عزّت بے عزّتی کے جنجال میں پھنستے ہی نہیں۔ سنگنی تو تتلی کی طرح آزاد اُڑنا چاہتی تھی، کھلی فضا میں ہوا میں خوشبو کی طرح تیرنا چاہتی تھی، جنگلی پھول کی طرح مست کھلنا چاہتی تھی اور آزاد پرندوں کی طرح کھلے آسمان میں اُڑنا چاہتی تھی۔ مگر ماں باپ سے اُس کی خواہشات، اس کے ارادوں کی تیز رفتاری چھپی نہ رہ سکی۔ اپنی عزّت کو داغدار ہونے سے بچانے کے لیے اُنھوں نے اُس کے پر کاٹ کر نئے پنجرے میں اُسے ڈال دیا۔

ماں باپ کی پابندیوں سے چھٹکارا ملا تو پتی کی آنکھوں میں قید ہوگئی۔ کارتک ایک کمسن خوبصورت بیوی پا کر بے حد خوش تھا۔ اُس کے دوست اُس کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اُس کا رنگ گندمی ضرور تھا مگر اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ جسم گٹھا ہوا، بل کھاتی کمر اور اُس پر جھولتی لمبی چوٹی، پیشانی چوڑی اور آنکھیں کالی اور بادام جیسی موٹی اور آواز سُریلی اور دل فریب چال، خوش مزاج خوش گفتار شوخ الھڑ۔ بس ایک ہی چیز کی کمی تھی کہ وہ اپنے سے زیادہ کسی اور کے لیے سنجیدہ نہ تھی۔ وہ خود سے زیادہ کسی سے بھی محبّت نہیں کرتی تھی۔

دُنیا کی اُسے پروا نہ تھی۔ گھر والوں کی باتیں، اُن کی نصیحتیں ایک کان سے سنتی دوسرے سے نکال دیتی۔ سنتی تھی تو صرف اپنے دل کی۔ یہ اُمید تو وہ کرتی تھی کہ اُس کا پتی اُس کے آگے پیچھے گھومے، اُس کے ناز اُٹھائے، اُس کے اشاروں پر چلے، اُسے دل و جان سے پیار کرے مگر وہ یہ بھول گئی کہ کسی کا پیار پانے کے لیے خود کو بھی کھونا پڑتا ہے۔ اُسے صرف لینا آتا تھا کبھی کچھ دینا اُس نے سیکھا ہی نہیں۔ اور جب کارتِک کے سامنے بیوی کا کچّا رنگ اُتر کر اصلی رنگ سامنے آیا تو اُس کی خوبصورتی اور دل فریب اداؤں کا نشہ، جو اُس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا، ایک جھٹکے کے ساتھ اُتر گیا۔ کارتک پڑھا لکھا سمجھ دار، ٹھہرا اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اُسے ہر رشتے کا پاس تھا، اُسے رشتے نبھانے آتے تھے۔ وہ سنگنی کی نادانیاں یہ سمجھ کر نظر انداز کرتا گیا کہ ابھی وہ کم سن ہے، الھڑ ہے۔ دونوں میں تقریباً دس سال کا فرق تھا۔ اُس نے بھرپور کوشش کی کہ وہ اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھا سکے۔ اُسے سنگنی کا اُس کے دوستوں کے بیچ بیٹھ کر کھلا مذاق کرنا قطعی پسند نہ تھا۔ کئی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر دونوں میں کئی بار تکرار بھی ہوئی۔ وہ اُسے سمجھاتا تو وہ اُسے 'دقیانوسی' کہہ کر بات ختم کر دیتی۔ پھر دھیرے دھیرے اُس نے دوستوں کا اپنے گھر آنا جانا کم کر دیا۔ وہ اُسے سمجھانے میں ناکام رہا۔ جب سنگنی نے بیٹی کو جنم دیا تو کارتک کے دل میں اُمید جاگی تھی کہ شاید ماں بن کر اُس میں تھوڑی سی میچوریٹی آ جائے گی مگر یہ بھی نہ ہو سکا۔ وقت بڑھتا گیا اور وہ ویسی کی ویسی اپنے ہی رنگ میں رنگی رہی۔ کارتک شاید یہ بھول گیا تھا کہ سمجھ داری، دانائی عمر کے ساتھ نہیں آتی یہ تو دونوں میں اتفاق ہوتا ہے۔

سنگنی سے مایوس ہوا تھا اسی لیے اُس نے انکتا کے جنم کے بعد اپنا زیادہ سے زیادہ وقت بیٹی کو دینا شروع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماں کا ہر رنگ اُس میں بھی آ جائے۔ اور ہوا بھی یہی کہ انکتا نے ماں کی خوبصورتی اور باپ کی دانائی دونوں حاصل کر لی۔ ماں میں اس عمر میں بھی اتنا ٹھہراؤ نہیں تھا جتنا جوان بیٹی میں تھا۔ ماں باپ کے آپسی جھگڑے اور آئے دن کی تکرار یا پھر ماں کا ضرورت سے زیادہ چلبلا پن اور باپ کی سنجیدگی نے اُسے بچپن میں

ہی سیانا کر دیا۔

انکتا جوان ہوئی تو باپ کی عمر ڈھل رہی تھی مگر ماں ویسی کی ویسی جوان، خوبصورت دلکش۔ اُس کی عمر جیسے تھم سی گئی تھی۔ جس نے زندگی میں کبھی کسی بات کی فکر نہ کی ہو، کبھی کوئی بات دل کو نہ لگائی ہو، عمر بھلا اُس کا کیا بگاڑ لے گی۔ اُس کی تو ادائیں، پہناوا، اُس کے بات کرنے کا انداز، نزاکت بھری چال سب ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اُسے تو اس بات کا رنج تھا کہ بیٹی نے ایک بھی گُر اُس سے نہ سیکھا۔ جب دونوں تیار ہو کر گھر سے نکلتی تو لوگ اُنھیں بہنیں ہی سمجھتے۔ اور جب لوگ اُن کے منھ پر یہ بات کہتے تو ماں کا سر فخر سے اکڑ جاتا اور بیٹی کو افسوس ہوتا کہ میری ماں دوسروں کی ماؤں جیسی کیوں نہیں۔ اُسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ اُس کی ماں اُس کے دوستوں سے ایسے گھُل مل کر ہنسی مذاق کرتی جیسے وہ ہی اُن کی دوست ہو اور وہ سب بھی اُن سے مل کر بہت خوش ہوتے۔ زندہ دل اور خوش مزاج شخص ویسے بھی محفل کی جان ہوتا ہے۔ ایسی محفلوں میں وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی۔ وہ خود کو اپنے پاپا کے زیادہ قریب محسوس کرتی تھی۔ اُس کے دل کی ہر بات بِنا کہے سُنے اُس کے پاپا سمجھ جاتے۔ اُس کا چہرہ پڑھنا اُنھیں خوب آتا تھا۔ بیٹی میں اُن کی جان بستی تھی۔

پھر ایک روز اُن کی ہنستی کھیلتی زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ کارتک کو فالج کا دورہ کیا پڑا وہ اُن دونوں کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ بیٹی تو دُنیا بھول کر باپ کی خدمت میں جٹ گئی اور سنگنی نے خدمت تو کی پر اُس کے رہن سہن میں کوئی فرق نہ پڑا۔ کارتک لاچار بے بس سب خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر ایک روز زندگی کی لڑائی لڑتے لڑتے وہ تھک ہار کر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ اس صدمے نے اُس حساس دل لڑکی کو غم کے اندھیروں میں ڈبو دیا۔ سنگنی نے کبھی سوچا نہ تھا کہ اِس طرح وہ تنہا رہ جائے گی۔ اس وقت غم نے اُسے ہلا ضرور دیا مگر یہ غم اُسے توڑ نہ سکا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اُس کی شادی ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں وہ ماں بن گئی۔ اور چالیس سال کی عمر میں وہ بیوہ بھی ہو گئی۔ بیس سال کی جوان بیٹی شاید اُس کے سینے کا بوجھ ہوتی مگر وہ تو اپنے باپ کی سمجھدار بیٹی تھی جس نے ماں کی اس فکر کو اُس کے دل میں پنپنے ہی

نہ دیا تھا۔ اکتالیس سال کی عمر میں اُس کی زندگی میں ایک اور نیا موڑ آیا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بھی کبھی گھر کی دنیا سے باہر مردوں کی دنیا میں قدم رکھے گی۔ زندگی جب معمول پر آئی تو زندگی جینے کے وسیلے تلاش کیے جانے لگے۔ خوبصورت جوان بیوہ کے مددگار بہت تھے۔ اُن میں سے زیادہ تعداد کارتک کے دوستوں کی ہی تھی۔ جن کا آنا جانا اُن کے گھر میں بہت کم تھا، اب وہ بے روک ٹوک مدد کے بہانے اُن کے گھر آنے جانے لگے۔ اب تو جوان خوبصورت لڑکی بھی ان کی نظروں میں آچکی تھی۔ چند لوگوں کی مدد اور کوشش سے سنگنی کو مرحوم پتی کے دفتر میں نوکری مل گئی۔ احسان بڑھ گئے تو اُنھوں نے اپنا حق بھی جتانا شروع کر دیا۔

سنگنی نے نوکری پر جانا شروع کیا تو لوگوں کی ہمدردی پوری اُس کے ساتھ تھی۔ کارتک کا اپنے دفتر میں بہت رسوخ تھا۔ لوگ اُس کی بڑی عزّت کرتے تھے اور جوان بے وقت موت نے بیوی اور بیٹی کے لیے ان کے دِلوں میں ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے سنگنی کو یہ نئی زندگی راس آنے لگی تھی۔ اُسے اب کہیں جا کر آزادی کا احساس ہوا تھا۔ اب وہ اپنی مرضی کی مالک آپ تھی۔ اب اُسے کہیں آنے جانے اور کسی سے ملنے کے لیے، چلتے فیشن کے کپڑے پہننے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جو لوگ کارتک کی بیوہ جان کر اُس سے ہمدردی کرتے تھے، اب اُس کا یہ نیا اور اصلی رُوپ دیکھ کر یہ بھول گئے تھے کہ وہ سوگوار بیوہ ہے۔ اب وہ بھی اُس کی اداؤں کے عاشق ہو رہے تھے۔ اُس کی اس آزادی میں صرف ایک رکاوٹ تھی اور وہ تھی اُس کی جوان بیٹی جو خاموش نگاہوں سے اُسے صرف تاڑتی رہتی تھی اور اب وہ اُن نگاہوں سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح وہ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اس ذمّے داری سے فارغ ہو جائے اور اس طرح خاموش نگاہوں کے سوالات سے بھی نجات حاصل ہو جائے گی اور وہ باقی کی زندگی سکون سے کاٹ سکے گی۔

دفتر میں اُس کی رفاقتیں بڑھنے لگیں تو بیٹی سے یہ سب چھپا نہ رہ سکا۔ ہر شام کارتک کے کسی نہ کسی دوست کے ساتھ دیر سے لوٹنا، رات دیر تک موبائل پر باتیں کرتے رہنا، اپنے

آپ میں مسکراتے رہنا، صبح صبح سنور کر تروتازہ ہو کر دفتر کے لیے بھاگنا— لوگوں نے دبی زبان میں باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ ماں بیٹی میں ایک خاموش دیوار کھڑی ہوتی جا رہی تھی جو شاید ایک دن انکتا کو ڈپریشن کا شکار بنا دیتی اگر اُس رات وہ سارے باندھ کھول نہ دیتی اور اپنے اندر جمع ہوئے طوفان کو بہہ جانے نہ دیتی۔

ہوا یوں کہ اُس شام دفتر سے لوٹتے لوٹتے اُسے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ شام ڈھل گئی اور چاند بھی آسماں پر چمکنے لگا۔ انکتا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ کر اُسے ڈرانے لگے۔ اُسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو آج کل سڑکوں پر ٹریفک بھی تو بہت بڑھ گیا ہے۔ موبائل لگانے کی کوشش کرتی رہی پر ماں کا موبائل سوئچ آف تھا۔

پریشانی کے عالم میں وہ اندر باہر ٹہلنے لگی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ پاپا کے کسی دوست کو فون کر کے پوچھے کہ گھر کے سامنے سفید گاڑی آ کر رُکی۔ ماں اُس میں سے اُتری اور تب تک گاڑی کو جاتے دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ بیٹی دروازے پر کھڑی اُس کے آنے کا انتظار کر رہی ہے۔

"آج کچھ زیادہ دیر نہیں ہو گئی؟"

"ہاں کچھ خاص کام آ گیا تھا۔" وہ لاپروائی سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"آپ نے فون کر کے بتانا ضروری نہیں سمجھا؟ میں نے فون کیا تو فون بند آ رہا تھا۔"

"اچھا! مجھے پتا ہی نہیں چلا، اب دیکھتی ہوں۔" وہ پرس میں سے موبائل نکالنے لگی۔

"لگتا ہے کچھ ہی دنوں میں آپ کو دفتر اچھا لگنے لگا ہے۔"

"اب تو نوکری ضرورت ہے ہم لوگوں کے لیے۔ ہنسی خوشی کریں گے تو وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔"

"آپ کو یہ نہیں لگتا کاش یہ نوکری آپ کو پہلے مل گئی ہوتی؟"

اُس کی باتوں میں چھپے طنز کو وہ محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسے

خاموش دیکھ کر اُس سے رہا نہ گیا۔

''آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔''

''تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو صاف صاف کہہ دو۔''

''کہنا تو بہت کچھ ہے پر جانے دو۔''

''نہیں آج تم کہہ ہی ڈالو۔''

''بس اتنا ہی کہوں گی کہ آپ جس دفتر میں کام کرتی ہیں وہاں میرے پاپا کی بہت عزّت ہے، آپ کو نوکری اُن کی جگہ ملی ہے۔''

''تو....؟''

''اُن کی عزّت سنبھال کر رکھنا۔ کہیں داغدار نہ ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' وہ غصّے سے چلاّئی۔ اُس کا جسم غصّے سے کانپنے لگا تھا۔

''میں تو ہوش میں ہوں....'' اِس سے آگے وہ کچھ نہ بولی اور روتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بیٹی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر وہ وہیں نڈھال صوفے پر گر گئی۔ اُس کا بدن بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا جیسے کسی نے تپتے جسم پر ڈھیر سارا پانی ڈال دیا ہو۔ اور وہ سوچنے لگی یہ کب اور کیسے ہو گیا، اُس کی بیٹی اُس کی ماں بن گئی اور اُسے پتا ہی نہ چلا۔ پہلی بار اُسے اپنی عمر اور رُتبے کا احساس ہوا۔ پہلی بار عمر نے اُس کے دماغ پر دستک دی اور اُسی لمحے اُس نے طے کر لیا کہ وہ ماں ہے، ماں بن کر رہے گی۔ اپنی بیٹی کی ماں، اُس کے دوستوں کی ماں۔ ساری رات وہ اپنی بیوگی پر روتی رہی اور دھیرے دھیرے رات پگھلتی رہی اور اکتالیس سال کی عمر میں اُس کا نیا رُوپ سامنے آیا۔ وہ تھا کارتک کی بیوہ اور انکتا کی ماں کا۔

OO

لغزشِ آدم

ویسے تو برسات نے بھی زمانے کی طرح اپنا رنگ ڈھنگ بدل لیا ہے۔ اب وہ ہلکی ہلکی لگاتار ساون کی جھڑی نہیں لگتی، اب تو ساون کے مہینے میں بھی بادل کا آوارہ ٹکڑا نہ جانے کہاں سے گھومتا مچلتا آتا ہے اور پورے جوش وخروش سے برس کر چند منٹوں میں ہی گرج برس کر ایسے غائب ہوتا ہے کہ جیسے وہ برسا ہی نہ ہو، اس طرف کبھی آیا ہی نہ ہو۔ مٹّی کی سوندھی خوشبو اور ہلکی ہلکی نم مٹّی بادل کے برس جانے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ برسات بھی اس دور کے عشق کی طرح ہے۔ جس تیز رفتاری سے پیار کا نشہ چڑھتا ہے اسی برق خرامی سے اتر بھی جاتا ہے۔ بس پیچھے رہ جاتی ہیں چند نشانیاں۔ مگر اس کے برعکس ایک مدّت کے بعد ایسا ہوا ہے کہ دو دن سے لگاتار موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ وہ بار بار کرسی سے اٹھتا ہے، کبھی کھڑکی کھول کر باہر دیکھتا ہے۔ آسمان ابھی بھی برس رہا ہے۔ برسات کے رکنے کے کوئی آثار نہیں۔ پھر کبھی وہ بے چینی سے کمرے میں ہی ٹہلنے لگتا ہے۔ باہر کی برسات سے زیادہ وہ اپنے اندر کے سیلاب سے بے چین ہے۔ رات کی خاموشی میں اس کے اندر مچل رہے طوفان نے طبیعت میں بے قراری پیدا کر دی ہے۔ اسے اِس خموشی میں بھی آنے والے طوفان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ اِس آہٹ سے گھبرا کر اُس نے کھڑکی پھر کھول دی۔ بوچھار نے سیدھے اس پر حملہ کیا لیکن اس نے خود کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ آج اسے بارش کی ٹھنڈی پھوار بھلی لگ رہی ہے۔ جیسے تپتے ہوئے صحرا میں ننگے پاؤں چلتے چلتے اچانک سمندر اپنی پناہ میں لینے کو آوازیں دے رہا ہو۔ آج تو چار پیگ پی کر بھی سرور نے نہیں جکڑا۔ سونے کی کوشش کی تو نیند نے منہ پھیر لیا۔ آج تو اسے چھوی کا اُس سے لپٹ کر

سونا بھی برا لگ رہا تھا ور نہ یہ وہ کبھی پسند نہیں کرتا تھا کہ اُس کی بیوی سونے سے پہلے منہ پھلا کر یا منہ پھیر کر سو جائے۔ جب وہ گہری نیند سوگئی تو آہستہ سے اس نے چھوی کے بازو کو اپنے سینے سے الگ کیا اور دبے پاؤں ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر اندھیرے میں ہی بیٹھ گیا۔اس کا دماغ اب تیز تیز چلنے لگا کہ وہ آنے والے دنوں کا کس طرح مقابلہ کرے تاکہ اُس کی عزّت بھی بچ جائے اور اُس کا گھر بھی نہ ٹوٹے۔اگر اِس طوفان نے بیتے دنوں سے پردہ اٹھا دیا تو عزّت تو داغدار ہوگی ہی، وہ اپنا گھر بھی نہیں بچا پائے گا۔کس طرح وہ اپنے ماں باپ سے نظریں ملائے گا جو سارے گاؤں میں سینہ تان کر پھرتے ہیں کہ ان کا بیٹا ہندوستانی فوج کا سچا اور محنتی افسر ہے۔اگر اس پر لگائے جانے والے الزامات ثابت ہو گئے تو چھوی ایک پل بھی اُس کے ساتھ رہنا برداشت نہیں کرے گی۔وہ یہ سوچتے ہی انگاروں پر لوٹنے لگا۔کسی سے تو اسے دل کی بات کرنی ہوگی۔سوچتا رہا کون ایسا شخص ہے جو اُسے سمجھ بھی سکے اور اسے اِس طوفان سے باہر نکالنے میں مدد بھی کر سکے۔بہت سے دوستوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے اور آخر میں کرنل جگتار سنگھ کا چہرہ سامنے آتے ہی کچھ راحت محسوس ہوئی۔اسی وقت اس نے اپنا موبائل اُٹھایا مگر رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ رک گیا اور کل شام سات بجے کلب میں ملنے کا وقت مقرر کر اسے ایس ایم ایس کر دیا۔آدھی سے زیادہ رات اسی طرح کٹ گئی تو صبح ہونے سے پہلے وہ چھوی کے پہلو میں جا کر لیٹ گیا۔

صبح ابھی آنکھ بھی نہیں کھلی تھی کہ جگتار سنگھ کا فون آ گیا۔

"سب خیریت تو ہے جو رات کے تین بجے تو نے ملنے کا ایس ایم ایس کیا؟"

"کچھ خاص ٹھیک نہیں۔شام کو مل کر بتاؤں گا۔"

"لگتا ہے مسئلہ سنجیدہ ہے۔تُو ایسا کر گھر پر ہی آ جانا۔"

"گھر پر بھابھی کے سامنے بات نہیں ہو پائے گی اِسی لیے کلب میں ملتے ہیں۔"

"ارے یار وہ میکے گئی ہوئی ہے بس میں اور میری تنہائی ہے۔گھر پر بیٹھتے ہیں پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر شام سات بجے۔"

سارا دن بارش رُک رُک کر ہوتی رہے۔ جب وہ دفتر سے گھر پہنچا تو چھوی کو جاتے ہی کہہ دیا کہ ''مجھے کام کے سلسلے میں باہر جانا ہے تم کہو تو تمھیں سیما کے یہاں چھوڑ دوں۔ بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں وہاں جانے کو۔''

''آج تو مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''بنا کچھ مانگے مراد پوری ہو رہی ہے اِس لیے۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''ایک تو میڈم کا خیال رکھو، اوپر سے اِن کی باتیں سنو۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ اگر نہیں موڈ تو رہنے دو۔''

''میں نے ایسا کب کہا۔ میں ابھی تیار ہو کر آئی۔''

تین دن سے لگاتار چل رہی بارش نے موسم خوش گوار اور رنگین کر دیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی چھوی نے کہا

''آج تو موسم لونگ ڈرائیو پر جانے کا ہے۔ چھوڑو سیما اور ضروری کام کو، گھومنے چلتے ہیں۔''

''نہیں ڈیئر آج نہیں۔ آج تو مجھے جانا ہی ہوگا۔ کام ایسا ہے کہ چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

''کوئی پریشانی تو نہیں؟'' اس نے اس سے پہلے سندیپ کو اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو مستی اور رومانس کا دلدادہ ہے۔ کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اور آج ایسے موسم میں وہ انکار کر رہا ہے۔ بات تو فکر کی تھی اس کے لیے۔

''مائی ڈیئر جب تک تم میرے ساتھ ہو مجھے پریشانی چھو بھی نہیں سکتی۔ بس یہ تو سرکاری مسئلہ ہے جس پر کچھ مشورہ ضروری ہے۔ ڈیوٹی اِز ڈیوٹی ڈیئر۔''

''ڈیوٹی کی بات ہے تو ٹھیک ہے، کسی بیوٹی کی نہیں ہونی چاہیے۔'' اُس نے پھر شرارت سے چھیڑا۔

''آج جی بھر کر باتیں کر لینا سیما سے۔ دو گھنٹے بعد ملتا ہوں۔'' سیما کے گھر کے آگے اُسے اُتارتے ہوئے سندیپ نے کہا۔

اُسے وہاں چھوڑ کر گاڑی سیدھی کرنل جگتار سنگھ کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ جگتار سنگھ

اُسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اردلی نے ڈرائنگ روم کے کونے میں بنی بار پر دو گلاس، سوڈا، برف، نمکین، کاجو، گرم گرم چکن ٹکا اور کباب کی پلیٹیں سجا دیں۔ کھڑکیاں کھول دیں تاکہ بارش کی سوندھی سوندھی خوشبو اور نرم و نم ہوا کے جھونکوں سے اندر کا ماحول بھی خوش نما ہو جائے۔ ہوا کے جھونکوں سے ریشمی پردوں سے لگے چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں کے بجنے سے ماحول میں سنگیت پیدا ہونے لگا۔ کمرے میں پہلے سے ہی فریدہ خانم کی غزلیں چل رہی تھیں۔

''یار سندیپ جس ادا سے یہ گاتی ہیں 'آج جانے کی ضد نہ کرو' دل چاہتا ہے کاش کوئی مجھ سے ایسا کہے تو میں وہیں سب کچھ چھوڑ کر رُک جاؤں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

''اگر رُک گئے تو پچھتاؤ گے میری طرح۔'' سندیپ نے سنجیدگی سے دھیمی آواز میں کہا۔

''معاملہ نازک لگتا ہے۔ آؤ ہو جائے دو دو ہاتھ۔ پھر دل کھول کر بات کرنا۔''

دونوں بار کی طرف بڑھ گئے۔ جام سے جام ٹکرائے۔ ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے بات کا آغاز کرنے کو جگتار سنگھ نے ہی کہا:

''یار اب کہہ بھی دے جو تیرے دل پر بوجھ ہے۔ اپنے بچپن کے دوست سے نہیں کہے گا تو کس سے کہے گا۔ میں نے کہہ دیا ہے کوئی ہمیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ اب تُو کہے گا اور میں سنوں گا۔''

''تو جانتا ہے۔ جب تین سال پہلے ہندوستان کی طرف سے فوجی جوانوں اور افسروں کو کانگو میں یونائٹڈ نیشنز پیس کیپرز کے لیے بھیجا گیا تو ہماری سکھ رجمنٹ کے ایک سو بیس جوان اور آفیسر بھی تھے۔ اُن میں سے میں بھی ایک تھا۔ یہ نہ صرف میرے لیے بلکہ ماں بابا کے لیے بھی بڑے فخر کی بات تھی۔ شادی کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے، چھوی کو اچھا نہیں لگا تھا۔ اُس سے ایک سال کے لیے دُور جانا مجھے بھی بُرا لگا تھا مگر اُس ٹیم کے لیے چنا جانا میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ میرے کئی ساتھی اس ٹیم میں نہ چنے جانے کے لیے مایوس بھی تھے اور میری قسمت پر رشک بھی کر رہے تھے۔''

''مجھے یاد ہے جب تو کانگو گیا تھا اُس وقت میں لدّاخ میں تعینات تھا اور میں نے تجھے فون پر مبارک باد دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ افریقہ کے جنگلوں سے بچ کر رہنا کہیں کھو

مت جانا۔''

''شروع کے کچھ مہینے تو ٹھیک نکلے مگر بعد میں وہاں کا ماحول کچھ ایسا ہو گیا کہ میں بھی اس میں کھو گیا۔ چھوی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس ایک سال میں اپنی ادھوری پڑھائی مکمل کر لے گی اپنے میکے جا کر۔ میں بھی اُس کے اِس فیصلے سے بے فکر ہو گیا۔''

''اس ڈیوٹی کے لیے تمھیں پیسے بھی تو اچھے خاصے ملتے تھے۔''

''پیسہ زیادہ ملتا تھا، خرچ کوئی تھا نہیں اور وہاں غریبی بہت تھی۔ بس اسی بات کا فائدہ اٹھا کر جوانوں نے چوری چھپے بیس کیمپ کے اِرد گرد منڈلاتی جسم فروش عورتوں سے معمولی رقم کے عوض میں اپنی جسمانی بھوک مٹانی شروع کر دی۔''

''کیا انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں کی مقامی عورتوں سے کسی بھی قسم کا رشتہ قائم کرنا منع ہے۔ یہ یونائٹڈ نیشنز کے قاعدوں کے خلاف ہے؟''

''سب جانتے تھے مگر چوری چھپے سب چلتا تھا۔ کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ جوان ہی نہیں افسر بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ سب کام بڑی راز داری سے ہوتا تھا۔ اس وقت تو یہی سمجھا گیا مگر شاید سب یہ بھول گئے تھے کہ ہر گناہ اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔''

''کیا راز کھلنے سے پہلے بھی اسے گناہ سمجھا گیا یا یہ خیال اب آیا۔''

''ٹھیک کہتے ہو، اُس وقت تک میں بھی اسے عام سی بات سمجھتا تھا مگر اب جب اس چوری سے پردہ ہٹ رہا ہے اور نتیجے سامنے آ رہے ہیں تو لگتا ہے وہ گناہ تھا۔''

''تم اپنی بات کہہ ہی ڈالو کہ تم نے کتنے موقعوں کا فائدہ اٹھایا۔''

''نہیں یار، موقع کا فائدہ نہیں اُس وقت مجھ پر جنسی بھوک حاوی تھی جس کو مٹانے کے لیے میں بنا سوچے سمجھے بڑھتا ہی گیا۔''

''اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے تم اپنی غلطی کو جائز تو نہیں کہہ سکتے؟ خیر تم اپنا قصہ سناؤ۔''

''اس روز بھی اسی طرح بارش ہو رہی تھی۔ ہم چند افسر شہر کسی کام کے سلسلے میں گئے

تھے۔ موسم سہانا، خوشگوار اور دلکش تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ اسی سہانے موسم کا لطف اٹھانے کے لیے ہم سبھی پاس ہی کے ہوٹل میں چلے گئے اور ابھی جام کا دور شروع ہی ہوا تھا کہ چند جوان لڑکیوں کا گروپ شور مچاتا مستی کرتا وہاں آ پہنچا۔ ہم لوگوں نے انھیں کھانے کی دعوت دے دی جو انھوں نے بنا جھجک جھٹ سے قبول کر لی۔ ان سے تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب مقامی کالج کی طلبہ ہیں اور ہاسٹل میں ہی رہتی ہیں۔ ہفتے میں ایک دن یعنی سنیچر وار انھیں آؤٹنگ ملتی ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی نکولا جو مجھے اچھی لگی اور وہ بھی مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ جاتے وقت وہ اپنا موبائل نمبر ایک پرچی پر لکھ کر چوری چھپے سب کی نظریں بچا کر دے گئی۔ پہلے میں نے اسے لاپروائی سے پھینک دینا چاہا پھر نہ جانے کیوں میں نے اُسے جیب میں رکھ لیا۔''

''باقی کے تمھارے ساتھی بھی شادی شدہ تھے یا پھر کنوارے؟'' جگتار سنگھ نے نیا پیگ بناتے ہوئے گلاس میں برف ڈالتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''ایک دو کو چھوڑ کر سبھی کنوارے تھے۔ وہ سب تو کھل کر مذاق کر رہے تھے یا یوں کہوں فلرٹ کر رہے تھے اور ہم لوگ ایسے بیٹھے تھے جیسے اُن میں کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ اگلا سنیچر وار آیا تو میں شہر نہیں گیا۔ بیس کیمپ شہر سے کوئی بیس کلومیٹر کی دوری پر ہی تھا۔ یہ نہیں کہ میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر میں خود کو روک رہا تھا کیونکہ نکولا کا بھرا بھرا کسا ہوا جوان جسم، موٹے رسیلے ہونٹ اور بڑی بڑی کالی آنکھیں اس کے پکّے رنگ پر بھی نکھر رہی تھیں۔ اس کا سڈول جسم مجھے خیالوں میں دعوت دیتا رہا۔ میری پیاس بڑھتی گئی۔ کئی دنوں سے اس پیاس کو فریب دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب سمندر ہی پیاسے کو دعوت دینے لگے تو خود کو تشنہ رکھنا بہت مشکل ہے۔ میں بھی ایک انسان ہوں کوئی فرشتہ نہیں جسے اپنی خواہشوں کو اپنے قابو میں رکھنے کا ہنر آتا ہے۔ اگلے سنیچر وار میں شہر گیا تو اُسی ہوٹل میں مجھے نکولا پھر مل گئی۔ وہ ملاقات اتفاقاً نہیں تھی۔

''میں پچھلے ہفتے بھی آئی تھی مگر تم کیوں نہیں آئے۔ تمھارے باقی کے دوست تو آئے تھے۔''

اُس نے اس پیار سے گلہ کیا کہ میں پگھلتا چلا گیا۔ مجھے اپنی پیاس کا احساس شدّت

سے ہونے لگا۔ میرے دل و دماغ یہاں تک کہ میرے پورے وجود کو کام دیو نے اپنی جکڑ میں لے لیا۔ ایک گھنٹہ کافی شاپ میں باتیں کرنے کے بعد ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں تھے۔ بارش زمین کی پیاس بجھاتی رہی اور نکولا میری۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم نے سب بندھ توڑ دیے۔ سیلاب نے میرے اندر کی دہکتی آگ کو بجھا دیا۔ میری تشنگی مٹی تو خود کو تر و تازہ محسوس کیا۔ پھر ہر ہفتے چوری چھپے اُسی ہوٹل میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں اس سے جب بھی ملنے جاتا ڈھیر سارے تحفے لے کر جاتا جسے دیکھ کر وہ کھل اٹھتی۔ وہ مجھ سے پیار کرنے لگی تھی مگر میں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ چند مہینوں میں میں واپس لوٹ جاؤں گا پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔ ہمارا ساتھ عارضی ہے۔ اسے دوستی تک ہی محدود رہنے دو، دل کے معاملے سے دُور رکھو۔ مگر وہ خود کو محبت کرنے سے روک نہیں پائی۔ میں اس کی زندگی میں پہلا مرد تھا شاید اس لیے۔''

''کیا تم نے اُسے چھوی کے بارے بتایا تھا؟''

''نہیں، میں اُسے تکلف نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''اُسے تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے یا ڈر تھا کہ اصلیت جان کر وہ ملنا نہ چھوڑ دے۔'' جگتار سنگھ کی بات میں چھپا طنز سندیپ نے بھی محسوس کیا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''یار تجھے یہ ڈر نہیں لگا کہ اس طرح کے رشتے بنانے سے ایڈس کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ جو لڑکی پہلی ہی ملاقات میں تیرے ساتھ راضی ہو گئی وہ دوسروں کے ساتھ بھی تو....''

''نہیں جگتار وہ بالکل ان چھوئی کلی تھی۔ میں مانتا ہوں وہاں جسم فروش عورتوں سے لوگوں نے تعلق رکھا، ایڈس کے خطرے کو نظر انداز بھی کیا مگر نکولا ایسی ویسی لڑکی نہیں تھی میں نے کہا نا کہ میں اُس کی زندگی میں پہلا مرد تھا۔''

''چلو جو تو کہتا ہے میں مان لیتا ہوں۔ آگے بول پھر کیا ہوا؟''

''پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے شروع میں ہی اُسے کہہ دیا تھا کہ کسی بھی حالت میں حاملہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات کی پوری احتیاط بھی کی مگر ایک شام اُس نے

آ کر جب یہ خبر سنائی کہ شاید وہ ماں بننے والی ہے تو میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ بے حد خوش تھی حالانکہ اُن کے یہاں بھی کنواری لڑکی کا ماں بننا ایک گناہ سمجھا جاتا ہے مگر وہ میرے عشق میں اندھی حمل گرانے کی بات سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کہتی تھی: 'تم تو چلے جاؤ گے تمھاری نشانی میرے پاس رہے گی ہمیشہ'۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ اگر بچّے کی شکل صورت مجھ پر چلی گئی تو تم دُنیا سے یہ راز چھپا بھی نہ پاؤ گی کیونکہ ہندوستانی نین نقش افریقی نین نقش سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔'' بات کرتے کرتے وہ شاید نکولا کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''پھر اُس نے حمل گرایا کہ نہیں؟'' جگتار سنگھ نے شراب کی چسکی لیتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

''شاید ہاں! شاید نہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ دراصل اُس کے اگلے ہفتے کی ملاقات ہماری آخری ملاقات تھی۔ مجھے دس دن بعد وہاں سے جانے کا آرڈر مل گیا۔ اس آخری ملاقات میں مَیں نے پھر اُسے بہت سمجھایا اور حمل گرانے کے لیے خاصی بھاری رقم بھی دی۔ واپس آ کر سوچا تھا اُسے فون کروں گا پھر سوچا کہیں یہ بات آگے نہ بڑھ جائے اس قصّے کو یہی ختم کر دینا چاہیے۔ دھیرے دھیرے چھوی کے پیار اور اُس کے ساتھ نے اُس کا خیال تک میرے دماغ سے مٹا دیا۔''

''تم بھی برسات کے آوارہ بادل کی طرح برسے اور آگے نکل گئے۔ مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟ گنگا گئے گنگا رام جمنا گئے جمنا داس۔''

''جو جی میں آئے کہہ سکتے ہو۔'' اُس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس ختم کر دیا۔

''تجھے واپس آئے سال ہو گیا۔ تو مجھ سے اتنی بار ملا مگر کبھی اس سلسلے میں بات نہیں کی۔ اب بتا ماجرہ کیا ہے؟ تیری پریشانی کیا ہے؟''

''اب بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ راکھ کے ڈھیر سے چنگاریاں نکل آئی ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں کوئی چنگاری میرا آشیانہ نہ جلا دے۔''

''صاف صاف بتا یار بات کیا ہے؟''

''جوانوں اور افسروں کی ان حرکتوں کی شکایت اوپر تک پہنچ گئی تھی۔ اب ایک

انکوائری بیٹھی ہے۔ اُس کمیٹی کے ممبر کون کون ہیں یہ مجھے معلوم نہیں ہوا مگر ہوائیاں سب کی اُڑی ہوئی ہیں۔ ابھی تک اس بات کا علم چھوی کو نہیں ہے آج نہیں تو کل یہ بات کھل ہی جائے گی۔ یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر مجھے بھی شک کے دائرے میں لے لیا تو میں اُسے کیا جواب دوں گا۔ سنا ہے خفیہ ایجنسی سب پر نظر رکھ رہی تھی اور اُن کے پاس بے شمار ثبوت بھی ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ وہاں ایسے افریقی بچوں کی تعداد بڑھ گئی ہے جن کی رنگت اور نین نقش ہندوستانی ہیں۔''

''یار بات تو سراسر غلط ہی ہے۔ پوری دُنیا میں ہمارے ملک کا نام خراب ہو رہا ہے۔ سب فوجی یہ کیسے بھول گئے کہ تم ہندوستان کے نمائندہ بن کر کانگو کے دُکھی عوام کی مدد کے لیے جا رہے ہو نہ کہ اُن کی مجبوری، لاچاری، بے بسی کا فائدہ اُٹھانے۔'' جگتار سنگھ کی آواز میں غصہ تھا۔

''مگر میں نے نکولا کا کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا، اُس سے کسی قسم کی زبردستی نہیں کی۔ وہ اپنی مرضی سے راضی ہوئی۔'' سندیپ نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''تو نے زبردستی تو نہیں کی مگر اپنی ضرورتوں کے لیے اسے استعمال تو کیا ہے؟ بات افسوس کی ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے۔ تم نے صرف اپنی بات بتائی ہے تصویر کا دوسرا پہلو میں تمھیں دِکھاتا ہوں۔ دراصل یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان پہلی بار چوری کرتا ہے تو ڈر ڈر کر کرتا ہے اور اگر وہ پکڑا نہ جائے تو اُس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ یہی تم سب کے ساتھ ہوا...

''ایک شام ایک جوان نے رات کے وقت کیمپ کے باہر گھومتے گھومتے ایک جسم فروش عورت سے سودا طے کر لیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ دیر رات کیمپ کے اندر جائے گی اور وہ جوان اُسے اس کے بدلے اس کے بچوں کے لیے چکن اور روٹی دے گا۔ وہ ایک مجبور ماں تھی جو اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لیے ایک بار پھر بک گئی۔ طے شدہ وقت پر جوان اُسے فوجی لباس پہنا کر چھپتے چھپاتے کیمپ کے اندر لے گیا۔ خیمے میں پہنچ کر ایک کے بعد ایک کر کے دس جوانوں نے اُسے باری باری اپنی بھوک کا شکار بنایا۔ وہ وہاں سے بھاگ

بھی نہیں سکتی نہ ہی شور مچا سکتی تھی اور جب اُسے باہر نکلتے وقت چکن اور چند روٹیاں دی گئیں تو وہ تلملا اُٹھی۔ باہر اُس جیسی تین اور عورتیں اِس دھوکے کی شکار کھڑی تھیں۔ جب انھوں نے مل کر شور مچانا شروع کیا تو بات کو دباتے ہوئے جلدی جلدی کچھ اور چکن، کچّے چاول اور کھانے پکانے والا تیل تھما کر اُن کا منہ بند کر دیا۔ مگر یہ سلسلہ یہاں تھما نہیں لگاتار بڑھتا ہی گیا۔ کیا ایک فوجی کو ایسا کرنا چاہیے؟ کیا یہ غلط نہیں ہے؟ اُس وقت سکھ رجمنٹ کے جوان یہ کیسے بھول گئے کہ ہمارے ہی ایک افسر میجر گربچن سنگھ کو پچاس سال پہلے پرم ویر چکر سے اِس لیے نوازا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے فرائض کو جی جان سے نبھایا اور اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ اُسی رجمنٹ کے افسروں اور جوانوں نے جو کیا۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں؟''

سندیپ حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تم اتنی باتیں کیسے جانتے ہو؟ کیا یہ بات عام ہو چکی ہے؟''

''ابھی تک تو یہ عام نہیں ہوئی مگر بہت جلد یہ سب کے سامنے آ جائے گی۔''

''میں تمھیں اتنی دیر سے وہاں کی باتیں بتا رہا تھا مگر تمھیں اس معاملے کا پہلے سے ہی پتہ تھا؟''

''مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ کمیٹی نے کیا سوچ رکھا ہے۔ بتاؤں؟''

''بتاؤ۔''

''ڈی این اے ٹیسٹ۔ سبھی جوانوں اور افسروں کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوگا۔ جو جو شک کے دائرے میں ہیں اُن کا، اور تم بھی اُن میں سے ایک ہو۔ بہت جلد تمھیں نوٹس ملنے والا ہے۔''

''تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟'' سندیپ نے گھبرا کر پوچھا۔

جگتار سنگھ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا:

''انکوائری ٹیم میں میں بھی شامل ہوں۔''

باہر بادل زور سے گرجا اور اُس نے ایک ہی گھونٹ میں باقی کی شراب حلق سے اُتار دی۔

OO

اندھیرے اُجالے

چوراہے پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ وہیں ٹھٹھک کر رُک گئی۔ شام کے اِس وقت ایسے موسم میں جب ٹھنڈی تیکھی تیز برفانی ہوائیں بدن کو اندر تک چیرتی ہوئی نکل جاتی ہیں، لوگ اپنے اپنے گھروں میں آگ سلگا کر دروازے کھڑکیاں بند کر کے آرام سے بیٹھے ہوتے ہیں اور سڑک پر اکّا دُکّا آدمی ہی نظر آتا ہے اور آج ایسے طوفانی موسم میں اتنے لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے سکڑے، سمٹے، آنکھیں پھیلائے چوراہے کے بیچ کھڑے اُن دو آدمیوں پر نظریں جمائے خاموش کھڑے ہیں۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود موت سا سناٹا ہے اور اِس خاموشی کو چیرتی ہوئی اُن دونوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جب اُن کے ادھ ننگے جسموں پر کوڑے برستے ہیں۔ اُن کے جسم چھلنی ہو چکے ہیں۔ کئی جگہ سے خون بھی رِسنے لگا ہے مگر وہاں کھڑے کسی کی بھی آنکھوں میں اُن کے لیے رحم نہیں نظر آ رہا۔ صرف نفرت کے شعلے برس رہے ہیں۔ یہ دونوں وہی گنہگار ہیں جو اِسی بستی میں پلے بڑھے اور پھر انسان سے حیوان بن گئے۔

ابھی دس دن پہلے ہی تو نین تارا یہاں کے سرکاری اسکول میں تبادلہ ہو کر آئی ہے۔ اس دُور دراز جگہ پر وہ کبھی نہیں آنا چاہتی تھی مگر اُس کی مجبوری اُسے یہاں کھینچ لائی۔ اگر وہ یہاں جوائن نہ کرتی تو ممکن تھا اتنی جدوجہد کے بعد ملی سرکاری نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔ یہاں آنے سے پہلے اُس کے دل میں طرح طرح کے خیال اُٹھ رہے تھے، یہاں کے لوگ کیسے ہوں گے۔ اس پچھڑے علاقے کے لوگوں کی سوچ، رہن سہن کیسا ہو گا۔ اُس نے سنا تھا

کہ اس علاقے میں دہشت گردوں کا بھی آنا جانا ہے۔ وہ اس نئی جگہ میں خود کو محفوظ رکھ پائے گی کہ نہیں؟ مگر یہاں آ کر اُس کا سارا ڈر جاتا رہا۔ پہاڑوں میں بسا یہ چھوٹا سا گاؤں اپنی خوبصورتی کی ایک مثال ہے۔ یہاں کے لوگ صاف دل اور سادہ زندگی گزارنے والے ہیں۔ یہ لوگ محنتی بھی ہیں۔ دوسروں کے سکھ دُکھ میں ساتھ دینے والے اور پرائے لوگوں کو بہت جلد اپنا لینے والے۔ چھوٹے چھوٹے تین چار گاؤں کے لیے یہاں ایک ہی اسکول ہے اور ایک چھوٹا سا سرکاری اسپتال۔ یہاں کی پنچایت ہی لوگوں کے جھگڑے اور مشکلیں سلجھا دیتی ہے۔ پولیس اِس علاقے میں کبھی نہیں آئی۔ آج چوک پر یہ جو منظر وہ دیکھ رہی تھی یہ اُس کے لیے نیا بھی تھا اور عجیب بھی۔ اُس نے وہاں کھڑی ایک عورت سے اِس کے بارے میں معلوم کیا تو اُس نے بتایا۔

''وہ جو سانولا سا لمبے قد والا اُنیس بیس برس کا مریل سا لڑکا ہے جسے کھمبے سے باندھ رکھا ہے، اِس کا نام منگوں ہے۔ اِس دُنیا میں اِس کا اپنا کوئی نہیں۔ اسی جگہ پر لوگوں کے رحم و کرم پر پلا بڑھا ہے۔ ہمیشہ چپ چاپ اپنے میں کھوئے رہنے اور ہمیشہ نظریں جھکائے رکھنے والا سیدھا سادہ دِکھنے والا شیطان بھی ہوسکتا ہے کسی نے نہ سوچا تھا۔ اس معصوم چہرے کے پیچھے گھناؤنی شخصیت چھپی ہے کسے معلوم تھا۔ نہ جانے اِس سے پہلے اُس نے کتنے گناہ کیے ہوں گے۔ اگر چمپا اپنی آنکھوں سے درندے کو پانچ سال کی گاؤں کی ہی بچی کو چوڑیوں کا لالچ دے کر اسے بہلا پھسلا کر جھاڑیوں کے پیچھے لے جاتے نہ دیکھ لیتی تو یہ اندھیرے اور معصومیت کا فائدہ اُٹھالیتا اگر وہ عین وقت پر اُسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑ لیتی۔''

اُس نے نفرت سے ایک بار پھر منگوں کو دیکھا اور تھوک دیا۔

''وہ دوسرا شخص کون ہے؟ اُسے کیوں اس طرح باندھ رکھا ہے؟''

''یہ موٹا سا بھدّا سا شخص روشن لال ہے۔ نام روشن ہے مگر نیت کالی ہے۔ تقریباً سات سال پہلے اس گاؤں میں ٹھیکے داری کرنے آیا تھا اور پھر یہیں بس گیا۔ اپنے غریب دوست کی مدد کے بہانے اُس کی بیوی کی عزّت کی دھجیاں اُڑا دیں۔ دوست کے گھر بیٹھ کر شراب

پی اور جب پتی نشے میں بے ہوش ہو گیا تو اپنا اصلی چہرہ دکھا دیا۔ دوستی، اعتبار، شرافت، انسانیت کا خون کر کے وہاں سے نکل گیا۔ صبح بیوی کی حالت دیکھ پتی سر پکڑ کر بیٹھ گیا مگر بیوی نے بزدل شوہر کی ایک نہ سُنی اور ساتھ والے گاؤں کے 'چیتنا دَل' کے لیڈر سے ملی۔ بس پھر کیا تھا۔ باقی سب تو آپ کے سامنے ہے۔''

''چیتنا دَل! یہ تو میں پہلی بار سن رہی ہوں۔ یہ کیا چیز ہے؟''

پھر اُسی نے بتایا کہ کبھی اِس علاقے میں چودھری خاندان کا کافی بول بالا تھا۔ ان کے بزرگ گاؤں کے سردار سب سے پیار کرنے والے اور سب کے دُکھ تکلیف میں کام آنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ لوگ اُن کی دل سے عزّت کرتے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے اُس خاندان کی عزّت کم ہوتی گئی۔ جس کا ذمّے دار چودھری خاندان کا اِکلوتا وارث دلیپ چودھری تھا۔ وہ جوان کیا ہوا گاؤں میں ایک آندھی طوفان آ گیا جیسے تلسی میں بھنگ کا پودا لگ گیا ہو۔ گاؤں کی بہن بیٹیوں کی عزّت محفوظ نہ رہی۔ لوگوں میں ڈر، نفرت، غصّہ اور پھر بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ اُس کا دَبدبہ اتنا تھا کہ کوئی پولیس والا بھی ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ ایک روز اِس آندھی کو روکنے کے لیے گاؤں کے چند باغی نوجوانوں نے رات کی سیاہی کا فائدہ اُٹھا نشے میں چور چودھری خاندان کے چراغ کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیا۔ بظاہر لوگوں نے چودھری خاندان کے ساتھ ہمدردی جتائی مگر سب نے دل ہی دل میں راحت محسوس کی۔ دلیپ چودھری کی وفات کے بعد اُس خاندان کا بول بالا ختم ہو گیا اور گاؤں کی باگ ڈور اُن چند نوجوانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ نہ صرف اُس گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں کے اہم مسائل پر اُن کی رائے لی جاتی۔ اُن کا فیصلہ اٹل ہوتا۔ سب اُن کے فیصلے کا احترام کرتے۔ گاؤں میں امن وامان کا ماحول قائم ہوا اور ترقی بھی ہوئی۔ اُنھی چند نوجوانوں نے ایک تنظیم قائم کی جسے 'چیتنا دَل' کا نام دے دیا۔ نہ صرف اپنے گاؤں کے بلکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ، جن کو انصاف نہیں ملتا یا کوئی کسی کی زیادتی کا شکار ہو جاتا تو اپنی فریاد لے کر اِن تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کے معاملے میں تو پولیس تک نہیں بولتی۔

''مگر یہ تو ہمارے ملک کے آئین کے خلاف ہے۔ قانون کے ہوتے یہ لوگ قانون کو اپنے ہاتھوں میں کیسے لے سکتے ہیں؟''

''قانون؟ کیسا قانون؟ روپے پیسے والا مجرم باعزّت بری ہو جاتا ہے اور غریب انسان ہر طرف سے ظلم سہتا اور پستا رہتا ہے۔ انصاف بکتا ہے ہمارے ملک میں۔ آپ نے دیکھا نہیں انصاف کی دیوی کی آنکھوں پر پٹّی بندھی ہے۔ قانون سچ میں اندھا ہے۔ ایک ابلا کی اگر عزّت لوٹ لی جاتی ہے اور وہ ہمّت کر کے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا بھی دے تو رہی سہی عزّت کی دھجیاں عدالت میں اُڑ جاتی ہیں۔ کئی سالوں تک مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوتا اور آخر میں مجرم دندناتا ہوا قانون کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں تو فیصلہ ابھی کے ابھی ہو جائے گا۔ جرم کیا ہے تو سزا ملے گی ہی، اس میں سال نہیں لگیں گے۔ بس آج ابھی ان کا فیصلہ ہو جائے گا اور دیکھنا سزا ابھی ابھی مل جائے گی۔'' وہ حیرانی سے اُس اَن پڑھ عورت کی باتیں سنتی رہی۔ اس کی زندگی کا تجربہ، کتابوں کے مشاہدے سے زیادہ تھا جو کڑوا سچ بن کر اُس کی زبان سے نکل رہا تھا۔ اُس کی باتوں نے اُسے لاجواب کر دیا۔ وہ خاموش ہو کر لوگوں کی طرح بھیڑ میں شامل ہو کر گنہگاروں کا انجام دیکھنے لگی۔

نوجوان بھیڑ کو چیرتے ہوئے چوراہے پر بنے چبوترے پر کھڑے ہو گئے۔ کوڑے برسنے بند ہو گئے اور پھر ایک رُعب دار آواز نے چپّی توڑی۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔ ان دونوں کو اپنی صفائی کا پورا موقع دیا گیا تھا۔ دونوں نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے اور یہ سب سے معافی چاہتے ہیں۔ کیا آپ سب ان کو معاف کرنے کو تیار ہیں؟''

''بالکل نہیں۔ اِن کو سزا ملنی ہی چاہیے۔'' یہ آواز عوام کی تھی۔

''انھوں نے رشتوں، اعتماد، انسانیت اور دوستی کا خون کیا ہے۔ انھوں نے ایک ماں، ایک بیٹی کی عزّت کو پامال کیا ہے۔ سال میں ہم دو بار دُرگا اشٹمی بڑی عقیدت سے مناتے ہیں۔ بچّی کو دُرگا ماں کا رُوپ سمجھ کر اُس کی پوجا کرتے ہیں اور پھر حیوانیت کی سبھی حدیں پار

کر اُس کی عزت پر ہی حملہ کر دیتے ہیں۔ ان حیوانوں کو سزا ملے گی تا کہ پھر کوئی دوبارہ ایسا گناہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔''

''آپ سب سہمت ہو؟''

''ہاں بالکل سہمت ہیں۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔ ''ٹھیک ہے تو پھر انھیں جان سے نہیں مارا جائے گا۔ ان پر اتنے کوڑے برسیں گے کہ جب تک زندہ رہے اِن کوڑوں کی آواز اور درد کا احساس اُن کے جسم اور کانوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ سپنے میں بھی دوبارہ ایسا گناہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ سزا کے طور پر اِن کا کوئی نہ کوئی جسم کا انگ کاٹ دیا جائے گا۔ انھیں یہاں سے دُور بہت دُور کسی سرکاری اسپتال میں پھینک آئیں گے تا کہ یہ زندہ رہیں اور تا عمر گناہ کی سزا بھگتتے رہیں۔ کسی کو کچھ کہنا ہے؟ کیا کارروائی شروع کی جائے۔''

''بالکل شروع کرو۔''

وہ نوجوان چبوترے سے نیچے اُتر آئے۔ شام ڈھلنے لگی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ عورتیں اور بچّے اس بھیڑ سے چھٹنے لگے۔ اگلی کارروائی شروع ہو رہی تھی۔ وہ بھی اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔ اُس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کیا یہ باغی ہیں۔ دہشت گرد ہیں یا انقلابی ہیں؟

OO

بدگمانیوں کی آنچ

سندیپ کی شادی کی خبر بم کی طرح پریتی پر ٹوٹی۔ اتنی جلدی سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا اُس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ اُس کے خواب، اُس کی تمنائیں سب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔ دھماکہ اتنا زبردست تھا کہ وہ خود کو سنبھال ہی نہیں پائی۔ اپنے دفتر کی کرسی پر وہ سر جھکائے فائل پر کچھ لکھ رہی تھی۔ جیسے ہی فرید نے برانچ پر آ کر یہ کہا کہ ''سندیپ نے شادی کر لی'' اُس کا ہاتھ وہیں رُک گیا۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس خبر کے تاثرات اُس کے چہرے سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب کی نظریں اُسی کی طرف تھیں۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اُٹھی اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ چہرے پر سناٹے کی پرچھائیں، آنکھوں میں بارش کا دُھندلا پن اور قدموں میں طوفان کی لرزش جھیلتے جھیلتے اپنے اِرد گرد کے ماحول سے بے خبر وہ بھاری قدموں سے اپنے گھر میں داخل ہوئی اور بستر پر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ آج وہ جس آگ میں جھلس رہی تھی یہ آگ اُسی کی لگائی ہوئی تھی۔ اُس نے خود اپنا آشیانہ جلایا تھا۔ اگر وہ عقل سے کام لیتی تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔

چار سال پہلے اُس کی شادی سندیپ کے ساتھ پورے رسم و رواج کے ساتھ ہوئی تھی۔ شوہر کی نوکری شہر میں تھی اس لیے اُس نے ہماچل کے گاؤں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر شہر میں اپنا آشیانہ بنا لیا۔ سندیپ نے پریتی کو دل و جان سے چاہا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ پریتی کی خوبصورتی کا وہ شیدائی تھا۔ گھر سے دفتر جاتا تو اُس

کا ذہن پریتی کے خیالوں میں ہی کھویا رہتا۔ آٹھ گھنٹے کی دُوری اُسے کھلنے لگی تو اس نے سفارش ڈھونڈ کر یہ مسئلہ بھی حل کر لیا۔ اپنے ہی دفتر میں اُسے نوکری دلوادی۔ پریتی پڑھی لکھی ذہین اور محنتی لڑکی تھی۔ دونوں ایک ساتھ دفتر جاتے، لنچ بھی ساتھ کرتے اور ایک ساتھ ہی شام کو گھومتے گھماتے گھر لوٹ آتے۔ کچھ ہی دِنوں میں پریتی نے محنت اور لگن سے دفتر میں اپنی جگہ بنالی۔ سندیپ بے حد خوش تھا مگر جب کوئی اُس کی بیوی کی خوبصورتی اور کام کی ضرورت سے زیادہ تعریف کرتا تو اُسے یہ بات پسند نہ آتی۔ دھیرے دھیرے وہ ایسے لوگوں سے کترانے لگا۔ انھیں دیکھ کر اَن دیکھا کر دیتا۔ بھری دُنیا میں ماں اور بیوی کے علاوہ اُس کا اور کوئی نہ تھا۔ اُس کی دنیا دونوں سے شروع ہو کر اُن پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ بڑی مشکلیں سہہ کر ماں نے اُسے پالا تھا۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اُس کا مستقبل سنوارا تھا۔ بیٹا پیروں پر کھڑا ہوا تو اُس کے دن بدلے۔ چاندسی بہو آئی تو گھر روشن ہو گیا۔ گاؤں کا پشتینی گھر چھوڑ کر بہو بیٹے کی خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹنے شہر آ گئی۔ ساس رہنے کیا آئی بہو کے منصوبے پر پانی پھر گیا۔ وہ اپنی ماں کو وہاں بلانا چاہتی تھی جس کے لیے اُس نے اپنے پتی کو کچھ حد تک راضی بھی کر لیا تھا مگر اب ساس کے آجانے سے اُس کی ماں نے اپنا وہاں آنے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا جس سے رنجش کا بیج بہو کے دل میں دھیرے دھیرے پنپنے لگا۔ جسے سندیپ نے بھی محسوس کیا۔ اس نے بڑے پیار سے اپنی بیوی پر یہ واضح کر دیا کہ:

"ساری دنیا ایک طرف اور میری ماں ایک طرف۔ تمھیں ہر بات کی آزادی ہے مگر میری ماں کو کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اُس کا دل کبھی نہ دُکھانا، اُس نے اپنی بساط سے زیادہ دُکھ سہے ہیں۔" عقلمند کے لیے اشارہ ہی بہت ہے۔ اُس نے اپنے جذبات کو لگام دی اور پوری توجہ شوہر کو قابو کرنے پر مرکوز کر دی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو گئی۔ وہ دیوانا بنا اُس کے اشاروں پر ناچنے لگا اور وہ اُس کی دیوانگی کے باعث خود کو اُس کا خدا سمجھنے لگی۔ شوہر کی کمزوری نے اُسے مضبوط اور مغرور بنا دیا اور مغرور انسان خود اپنے دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلتا۔ اُسے اپنے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ماں کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی جو

ساس کے ہوتے ممکن نہ تھا۔ اس لیے اُس نے پتی کے پیٹھ پیچھے ساس سے ایسا برتاؤ کرنا شروع کر دیا کہ وہ تنگ آ کر خود بخود ہی واپس گاؤں چلی جائے۔ وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ساس یہ سب باتیں اپنے بیٹے کو کبھی نہیں بتائے گی۔ بیٹے کا ہنستا کھیلتا بسا بسایا گھر اُس کا خواب ہے۔ وہ بھی پتی کے سامنے ایک اچھی بہو کی اداکاری بہت خوبصورتی سے کرتی۔ ایک روز بدقسمتی سے اُس کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور سندیپ اکیلے ہی دفتر گیا تھا۔ شام کو وہ وقت سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا مگر دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رُک گیا۔ پریتی کی چلاّ چلاّ کر بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس کا ایسا رُوپ وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شاید کام والی سے کوئی قیمتی چیز ٹوٹ گئی جو وہ اس قدر غصّے میں ہے مگر جب وہ اندر پہنچا تو اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اُس کی ماں لاچار بے بسی کی مورتی بنی سر جھکائے خاموش اپنی بہو کی تیز طرّار جلی کٹی باتیں سن رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اُسے سامنے دیکھ کر دونوں کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ بیوی کا چوری پکڑے جانے سے اور ماں کا بیٹے کے دل پر چوٹ لگنے کی وجہ سے۔ دو منٹ اُس نے دونوں کو دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے سنے تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔

دو تین گھنٹے بعد جب سندیپ لوٹ کر آیا تو بیوی نے صفائی دینے کی کوشش کی جسے سننے سے اُس نے صاف انکار کر دیا۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ بس تم نے جو بھی کیا بہت غلط کیا۔ مجھے تم سے اس طرح کی امید نہیں تھی۔ تم ماں سے معافی مانگ لو اور آئندہ خیال رہے کہ پھر ایسا کبھی نہ ہو۔''

''مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ بس جا کر ماں سے معافی مانگ لو ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''انجام ہم دونوں کے لیے اچھا نہ ہوگا۔''

''مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''یہ ہی سمجھ لو۔''

''دھمکیوں سے میں ڈرتی نہیں۔ کوئی کام زبردستی میں کرتی نہیں۔ پیار سے منّت سے کہو تو مان لوں گی۔''

وہ اپنی ضد پر اَڑی رہی اور ماں کی بے عزّتی کے ساتھ وہ سمجھوتہ نہ کر سکا۔ دونوں میں جھگڑا پہلی بار ہوا اور وہ بھی اتنا بڑھ گیا کہ وہ غصّے میں گھر چھوڑ کر چلی گئی اور اُس نے روکا بھی نہیں۔ ماں نے بیٹے اور بہو کے آگے بہت ہاتھ جوڑے مگر لڑائی توانا کی تھی جس میں ماں کی آواز دب کر رہ گئی۔

وہ اُس کے گھر لوٹنے کا انتظار کرنے لگا اور وہ منتظر تھی کہ کب وہ اُسے لے جانے کے لیے آئے۔ اِسی کشمکش میں وقت گزرنے لگا۔ چار دیواری سے نکل کر اب بات دُنیا کے سامنے آ گئی تھی۔ کچھ دوست دل سے ہمدردی کرتے تھے تو کچھ ایسے تماش بین بھی تھے جنھوں نے آگ میں گھی کا کام کیا۔ پریتی کے ہمدرد بن کر اُس کے قریب جانے کی کوشش کی اور نمک مرچ لگا کر بنتے رشتے توڑنے میں لگ گئے۔ وہ اسی گمان میں انتظار کرتی رہی کہ وہ اُس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جلد ہی اسے بلانے چلا آئے گا اور جب یہ انتظار اُس پر بھاری پڑنے لگا تو اُس نے پتی کو ڈرانے کے لیے طلاق کے کاغذات بھیج دیے جنھیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھا۔ ایک چوری اوپر سے سینہ زوری، یہ اُس سے برداشت نہ ہوا۔ وہ یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید اب اُسے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اُس نے دل پر پتھر رکھ کر چپ چاپ دستخط کر کے وہ کاغذات واپس لوٹا دیے۔ زبردستی کے رشتے کا وہ قائل نہیں۔ دونوں اپنی ہی سوچ کے دائروں میں اُلجھتے رہے اور اُن کے رشتوں کی ڈور بھی اُلجھتی چلی گئی۔ گانٹھیں اتنی کس کر پڑ گئیں کہ ایک روز وہ رشتے کا دھاگہ ٹوٹ گیا جس کی ٹیس دونوں نے محسوس کی، پر ایک دوسرے پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ماں واپس گاؤں والے گھر میں چلی گئی۔ بیوی سے علیحدگی ہو گئی تو گھر کے ویران در و دیوار کاٹنے کو آتے۔ ہر شے میں اُسے پریتی کی پرچھائیں نظر آتی۔ دفتر میں پریتی کا غیر مردوں سے بات کرنا اُس کا دل جلاتا تو گھر میں بیتے لمحوں کی

چبھن اُس کے دل کے چین وقرار کی دھجیاں اُڑا دیتے۔ اُس کا دن کا سکون اور راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ ایک روز اس کیفیت سے گھبرا کر اُس کی یادوں سے چھٹکارا پانے کے لیے اُس نے گھر کا سامان بیچ دیا اور وہ گھر بھی چھوڑ دیا۔ خود وہ کسی کے یہاں پینگ گیسٹ بن کر رہنے لگا۔ اُس سے بھی جب اُسے راحت نہ ملی تو اُس نے پریتی سے دُور جانے کا فیصلہ کرلیا اور دفتر سے لمبی چھٹی لے کر ماں کے پاس گاؤں پہنچ گیا۔

اونچی اونچی پہاڑیوں کے بیچ بسا ہماچل کا ایک چھوٹا سا گاؤں چوپال جہاں وہ کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ اُس تازہ آب وہوا، کھلے ماحول اور ماں کے پیار بھرے آنچل نے اُس کے بھٹکتے ہوئے دل و دماغ کو سکون اور چین عطا کیا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ پھر تروتازہ ہو گیا۔ زندگی کی مایوسیوں، محرومیوں اور سرد تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی قوت پھر اُس کے اندر پیدا ہوگئی۔ ماں کے اسرار پر وہ ایک بار پھر نئی زندگی شروع کرنے کو تیار ہو گیا۔ وہ پھر سے اپنا ارادہ نہ بدل لے یہ سوچ کر ماں نے جلد ہی کچھ دنوں کے اندر اندر اسی گاؤں کی ایک عام شکل وصورت والی پڑھی لکھی لڑکی سے اُس کی شادی پکّی کردی۔ سندیپ نے شادی سے پہلے سب کچھ صاف صاف بتانا مناسب سمجھا اور اُس نے منجو سے مل کر اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ''میں ماں کی خوشی کے لیے یہ شادی کر رہا ہوں۔ زخم اتنے گہرے ہیں کہ بھرنے میں وقت لگے گا۔ اگر تم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہی ہاں کہنا۔''

''میں زخم بھرنے میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں مگر مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ دوبارہ اُس کی طرف کبھی رُخ نہ کریں گے۔ مجھے احساس ہے کہ اب بھی آپ کے دل میں اُس کے لیے پیار ہے اور پہلا پیار بُھلانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

'' کچھ بھی ہو جائے ایک بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں بے وفائی کا غم سہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

شادی بالکل سادگی سے ہوئی۔ اُس نے ایک ماہ کی چھٹی اور بڑھالی۔ چھٹی ختم ہوئی تو وہ اکیلے ہی شہر لوٹ آیا۔ اُسے نیا گھر بسانے کے لیے مکان اور نئے سامان کی ضرورت تھی

جس کے لیے تھوڑا وقت درکار تھا۔ ڈیوٹی جوائن کی تو سب کو اس کی شادی کی خبر بھی مل گئی جو پریتی کے کانوں تک بھی پہنچی۔ یہ خبر اُس پر قہر بن کر ٹوٹی۔ اس سے یہ سچائی ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ اُس کی جگہ کسی اور کو دے دی گئی ہے۔

سندیپ نے دس دن کے اندر ہی نئے مکان اور گرہستی کا ضروری سامان جُٹا لیا۔ اور پھر وہ ماں اور بیوی کو لینے گاؤں چلا گیا۔ ماں آنے کو راضی نہ ہوئی اور دونوں کو خوشی خوشی گھر بسانے کے لیے رخصت کر دیا۔ دونوں نیا گھر اور نئے رشتے کو سجانے سنوارنے میں جٹ گئے۔ سنجو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر موڑ پر اُس کا ساتھ دے گی اور وہ اپنا وعدہ نبھا رہی تھی۔ سندیپ کی زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ سردیوں کا موسم بدلا، بہار کا موسم آیا اور ساتھ ہی خوش خبری بھی لایا۔ اُن کا رشتہ اور مضبوط ہونے جا رہا تھا۔ ایک ننھا منا اُن کی زندگی روشن کرنے آ رہا تھا۔ اُڑتی اُڑتی یہ خبر بھی پریتی کے کانوں تک پگھلتے سیسے کی طرح پڑی۔ اس کے دل کی اُتھل پتھل اس کے چہرے پر آ جاتی تھی اور سندیپ کو کسی نہ کسی طرح سے اُس کی حالت کا علم ہو ہی جاتا۔ پریتی کو تڑپتا دیکھ اُسے سکون ملتا تھا۔ سبھی رشتے ٹوٹ جانے کے باوجود وہ نفرت کا رشتہ نہیں توڑ سکا۔

ایک رات سنجو میٹھی نیند سوئی ہوئی تھی کہ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔ آواز اُس کے حلق میں اٹک گئی۔ اُس نے ہمّت کر کے ساتھ سوئے پتی کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ بتّی جلائی تو وہ پسینے میں شرابور خوف سے اُس سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اُس کی حالت دیکھ وہ گھبرا گیا۔

کتنی دیر وہ سہمی رہی، اُس کے گلے سے آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔ اُس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو ہمّت کر کے اُس نے بتایا۔ ''کوئی عورت میرا گلا دَبا رہی تھی۔''

''کیا؟ اس وقت اس کمرے کا دروازہ بند ہے۔ تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔''

''سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میں نے گلے پر دباؤ محسوس کیا ہے اور ابھی بھی ہو رہا ہے۔'' اُس نے گلے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں یہ سب تمھارا وہم ہے، میرے اور تمھارے علاوہ کوئی نہیں اس کمرے میں۔گھبراؤ مت میں ہوں نا تمھارے پاس۔''

اتنا کہہ کر اُس نے اُسے سینے سے لگا لیا اور ہلکے ہلکے اُس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ساری تکلیف بھول کر اپنے پتی کی باہوں میں سکون کی نیند سو گئی۔صبح تک دونوں اس بات کو بھول گئے۔

جب دو روز بعد پھر وہی گلے پر دباؤ محسوس کر کے وہ چلائی تو وہ پریشان ہو اُٹھا۔اُٹھ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا اور پھر یہ آئے دن ہونے لگا۔اب وہ دونوں اِسی خوف سے رات رات بھر جاگ کر کاٹتے۔خوف اور بے آرامی سے سنجو کی صحت پر اثر پڑنے لگا تھا۔یہ کام کسی غیبی طاقت کا تھا جو اُنھیں پریشان کرنا چاہتی تھی۔اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی نام بار بار آ رہا تھا۔ پریتی! پریتی۔وہ ایک واحد عورت ہے جو اُس کی خوشی سے جلتی ہے۔ٹونے ٹوٹکے کے ذریعے وہ اُس کی بیوی اور آنے والی اولاد کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔رات بھر وہ انھی خیالوں سے جوجھتا رہا اور صبح دفتر پہنچتے ہی اس نے پریتی کو دھمکی دے ڈالی۔

''تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

''کیا کیا ہے میں نے؟''

''یہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم نے کیا کروایا ہے۔اگر میری بیوی کو کچھ ہو گیا تو تم بھی یہاں دکھائی نہیں دو گی۔''

وہ حیرانگی سے اُس کا منہ تکتی رہ گئی اور وہ غصّے سے اسے دھمکا کر چلا گیا۔اُس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ جو شخص اُس پر اپنی جان چھڑکتا تھا آج وہ کسی اور کی خاطر اُسے جان سے مارنے کی دھمکی دے گیا۔سندیپ کی پریشانی کا جب اُس کے دوست کو پتہ چلا تو وہ ایک پنڈت کو اُن کے گھر اپنے ساتھ لے گیا۔جس سے اُس کے اچھے مراسم تھے۔پنڈت جی نے سنجو کو دیکھتے ہی کہہ دیا۔

''اُس پر کسی اُوپری چیز کا سایہ ہے۔کوئی بدروح اس کے آس پاس منڈلا رہی ہے۔''

''ہمیں بھی یہی لگتا ہے آپ یہ بتائیں کہ اُس سے کیسے نجات مل سکتی ہے؟''

''پہلے معلوم کرنا پڑے گا کہ یہ ہے کیا؟ پھر اُس کے مطابق ہی علاج ہوگا۔''

''سب ٹھیک تو ہو جائے گا نہ پنڈت جی؟'' سندیپ نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

''گھبراؤ مت، سب کا علاج ہے۔ کل صبح پھر آؤں گا۔ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

اُسی شام پڑوس میں رہنے والی ایک بزرگ عورت نے اُنھیں دیکھ کر بلا لیا— ''لگتا ہے کوئی خوش خبری ہے۔'' وہ دونوں مسکرا دیے۔ ''مگر میں تمھیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ تمھاری ماں کی عمر کی ہوں اس لیے سب کہہ رہی ہوں۔''

''آپ بے جھجک سب کہہ سکتی ہیں۔''

''تم لوگ گھر بدل لو۔ جتنی جلدی ہو سکے یہ کام کرو۔'' وہ دونوں حیرانگی سے اُس کا منہ تکنے لگے۔ ''مگر کیوں؟''

''اس گھر میں ایک ایسی عورت کی آتما بھٹکتی ہے جس نے اپنے پتی کی شراب کی لت سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔ اُس نے خود کو آگ لگا لی اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی زندگیاں راکھ ہو گئیں۔ ایک زندگی نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ پتی کو جیل ہو گئی اور اُس کا بیٹا یتیم ہو گیا۔ سنا ہے اس کی آتما ابھی بھی بھٹکتی ہے، اُس کی مکتی کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔ کئی کرایے دار یہاں آئے اور ڈر کے مارے یہ مکان چھوڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ تمھیں نقصان پہنچے تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔''

سنجو اس بزرگ کو اپنا حال سنانے میں مصروف تھی اور سندیپ کے دل و دماغ سے بدگمانیوں کی تپش نے نفرت کی برف کو پگھلا دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ پریتی کی آنکھوں سے جھلکتی شکایت اور درد کے نشتر اُس کے سینے کو چھلنی کر رہے ہیں۔

OO

سیڑھی

جیسے ہی فون کی گھنٹی بجی اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو۔''

''فون کے پاس ہی بیٹھی تھی کیا؟''

''اگر دوسری گھنٹی بج جاتی تو یگم جاگ جاتا، بہت مشکل سے سلایا ہے اسے۔ یہ سب چھوڑو یہ بتاؤ کہ فون کیوں نہیں کیا جمعہ کو؟''

''سوچا تو تھا کہ تمھیں سرپرائز دوں گا۔ خود ملنے چلا آؤں۔ گھر سے نکل بھی پڑا پر شاید ابھی وقت نہیں آیا تم سے ملنے کا۔ اگر قسمت میں لکھا ہوگا تو ایک روز ملاقات ضرور ہوگی۔''

''ایک روز کیوں اسی ہفتے چلے آؤ۔''

''خیر! یہ تو دیکھتے ہیں، تم اپنی سناؤ، کیسا رہا تمھارا ویک اینڈ۔''

''میرا ویک اینڈ کیسا؟ میرے لیے تو ہر دن ایک جیسا ہوتا ہے۔ پورا ہفتہ تنہا یگم سے یا گھر کی دیواروں سے باتیں کرتے گزر جاتا ہے۔ انتظار ہوتا ہے کہ بچوں کو سنیچر اتوار کی چھٹی ہوگی، گھر میں رونق ہوگی۔ بیٹھ کر چار باتیں کریں گے۔ مگر وہ بھی اتنے مصروف ہوتے ہیں اپنے پورے ہفتے کے کاموں کو ختم کرنے میں کہ سکون سے بیٹھ کر دو باتیں کرنا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ تو شکر ہے کہ اتفاقاً آپ سے ملاقات ہوگئی ورنہ یہ زبان بولنا ہی بھول جاتی۔ پاگل کر دیتی یہ تنہائی مجھے۔''

''اتفاقاً ملاقات کب ہوئی؟ یہ کہو اتفاق سے غلط نمبر لگ گیا اور بات ہوگئی۔''

''چلو یہ ہی کہہ لو۔ ایک انجان ملک میں اجنبی لوگوں میں کوئی ہم زبان، ہم کلام اور

ایک ہمدرد تو ملا۔"

"شاید یہ ہمدرد بھی تمھارا ساتھ زیادہ دن نہ دے سکے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرا ٹکٹ آ گیا ہے اور میں اگلے ہفتے ہی ہندوستان واپس جا رہا ہوں۔"

"اگلے ہفتے؟ یہ پروگرام اچانک بنا کیا؟"

"دس بیس دن سے معلوم ہے مجھے، مگر میں نے تمھیں بتایا نہیں۔ میں جانتا تھا تمھیں اچھا نہیں لگے گا۔"

دوسری طرف سناٹا چھایا رہا۔

"ہیلو، کیا ہوا، فون پر ہو یا کاٹ دیا؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہی سوچ رہی تھی کہ باقی کے دن کیسے کٹیں گے۔ آپ سے تو اپنا ہر دُکھ سکھ بانٹ لیتی ہوں پھر اتنی دُور سے کہاں بات ہو پائے گی۔"

اس کی آواز میں چھپی مایوسی اور مجبوری کو وہ بخوبی جانتا تھا۔

"میں کوشش ضرور کروں گا ایک بار تم سے ملنے کی، پھر نہ جانے اس زندگی میں کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو۔"

"کیا کرو گے مل کر؟ خوش قسمت ہو جو واپس جا رہے ہو اپنے لوگوں کے بیچ۔ نہ جانے میری زندگی میں یہ دن کب آئے گا۔"

"تم مایوس نہ ہو، میں تمھارے بیٹے سے وہاں جا کر بات کروں گا اور جلد ہی تم واپس اپنے گھر اپنے لوگوں میں پہنچ جاؤ گی۔ اب میں رکھتا ہوں، پرسوں فون کروں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔"

اتنا کہہ کر ادھر سے فون کٹ گیا اور وہ وہیں صوفے کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھ گئی۔

پانچ مہینے پہلے وہ بڑی خوشی خوشی اپنی اکلوتی بیٹی مندیپ کے پاس کینیڈا آئی تھی۔ شادی کے سات سال گزر جانے پر بھی جب بیٹی کی گود ہری نہیں ہوئی تو اس نے بھی کئی منتیں

مانگ ڈالیں۔ کوئی مندر، مسجد، گرودوارہ نہیں چھوڑا اور جب اس کی دلی مراد پوری ہوئی تو وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ بیٹی کی زچگی میکے میں ہو مگر مندیپ اور اس کے شوہر نے صاف کہہ دیا:

''کیسی باتیں کرتی ہو ماں، بچہ یہاں پیدا ہوگا تو اسے شہریت بھی یہیں کی ملے گی۔ بس آپ اپنا پاسپورٹ تیار رکھیے۔''

''مگر میں وہاں آ کر کیا کروں گی؟ یہاں گھر کو بھی تو دیکھنا ہے۔''

''اتنے سال آپ نے ناک میں دم کر رکھا تھا اور اب جب آپ کی مراد پوری ہو رہی ہے تو آپ کہہ رہی ہیں میں کیا کروں گی۔''

''تم خود ہی بتاؤ میں وہاں کیا کروں گی۔ میں اَن پڑھ عورت نہ مجھے انگریزی بولنی آئے نہ میں اُن کی زبان جانوں نہ ان کی تہذیب۔''

''آپ کو لوگوں سے ملنا ہے یا ہم سے؟ اور پھر جب ہم ہیں آپ کا خیال رکھنے کو تو فکر کیوں کرتی ہو؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بیٹی کی بات ماننی پڑی۔ وہ شاید انکار کر بھی دیتی مگر بیٹی کی ایک بات نے اسے راضی کر لیا۔

''ماں تم ہی بتاؤ اس ننھی سی جان کو کہاں چھوڑوں گی۔ اگر چھٹی لے کر گھر بیٹھ جاؤں تو گزر بسر کیسے ہوگا۔ جب اس کے دادا دادی آ کر اسے سنبھال سکتے ہیں تو نانی کیوں نہیں؟ نانی بننا ہے تو فرض بھی نبھانے ہی پڑیں گے۔''

بیٹے اور بہو نے بھی سمجھا بجھا کر اسے راضی کر لیا۔

''کوئی بات نہیں ماں چھ مہینے کی تو بات ہے۔ ایک بار جا کر ہو آؤ۔ آپ کی آب و ہوا بھی بدل جائے گی۔ اور آنے والے بچے سے مل کر آپ کے دل کو بھی سکون ملے گا۔''

پھر جب اسے خبر ملی کی کہ مندیپ نے بیٹے کو جنم دیا ہے تو بچے کو دیکھنے اور اس کے ساتھ کھیلنے کی تڑپ اس کے دل میں بڑھتی گئی۔ پہلے چھ مہینے تو مندیپ کے ساس سسر نے کٹوا دیے پھر چھ مہینے کے لیے وہ بھی کینیڈا کے لیے روانہ ہوگئی۔

یگم کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگا کر اس کی یگوں کی پیاس بجھ گئی۔ اب اس کے دن یگم کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں میں گزرنے لگے۔ بیٹی اور داماد صبح سویرے ہی کام پر نکل جاتے اور شام ڈھلے ہی گھر لوٹتے۔ اس وقت تک وہ اتنے تھکے ہوتے کہ آرام سے بیٹھ کر بات کرنے کا بھی موقع نہ ملتا بس ایک ساتھ تینوں کھانا کھاتے، دن بھر کی باتیں اسی وقت ہوتیں اور پھر سونے کے لیے چلے جاتے۔

رات بستر پر لیٹتے ہی وہ اپنے گھر پہنچ جاتی۔ پنجاب کے جالندھر شہر کی بستی نو میں اس کا گھر ہے۔ اسی گھر میں وہ بیاہ کر آئی تھی۔ گلی محلے میں اس کی بڑی بنی بنائی تھی۔ تبھی تو اس کے دُکھ بھرے دن کچھ آرام سے گزر پائے۔ جب ایک روز اچانک اس کے شوہر کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا اور دو دو بچوں اور بوڑھی ساس کی ذمّے داری اس کے کاندھے پر آن پڑی تو یہ ہی محلے کے لوگ اس وقت کام آئے تھے۔ اپنوں سے زیادہ انھوں نے ساتھ دیا تھا۔ اس کی ایک آواز پر سبھی جمع ہو جاتے۔ کسی کے گھر کوئی بھی خوشی اس کی شرکت کے بغیر پوری نہ ہوتی۔ ہم عمر والوں کی بھابھی، بچوں کی چاچی اور بزرگوں کی بہورانی رہی۔ کہاں گھر کی اور محلے کی گہما گہمی اور رونق اور کہاں یہ ویرانی۔ یہاں انسانوں کو دیکھنے کو بھی وہ ترس گئی۔ نہ پرندوں کی چہچہاہٹ نہ کتّوں کے بھونکنے کی آواز نہ کوئی شور نہ ہنگامہ۔ وہاں اس کے گھر کے دروازے سارا دن کھلے رہتے۔ بنا روک ٹوک کوئی آرہا ہے تو کوئی جارہا ہے۔ یہاں کوئی کسی سے ملنے نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو فون کیے بنا نہیں اور چھٹی کے دن ہی آتا ہے۔

یگم کے رونے کی آواز سن کر وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے لوٹ آئی اور پھر اپنے آپ کو روزمرہ کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ بظاہر وہ مطمئن سب کام نپٹاتی رہی مگر جب سے اس نے فون پر سنا تھا کہ کھنّہ صاحب واپس ہندوستان جارہے ہیں، اس کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ آج رات کو ہی اپنے واپس جانے کی بات کرے گی۔ پھر وہ اطمینان سے بچوں کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

کھنّہ صاحب سے اس کی ملاقات اتفاق سے ہوئی تھی۔ ایک روز وہ اپنے کمرے

میں اُداس بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی کہ اسے چلتے پھرتے لوگ ہنستے کھیلتے بچے یا پھر کھلے آسمان میں اُڑتے پرندوں کی ڈار نظر آ جائے مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ اسے کھیلتے کودتے بچے نظر آئے نہ پیدل چہل قدمی کرتے لوگ اور نہ ہی پرندے۔ وہ نظر آتے بھی کیسے۔ چاروں طرف سفید برف کی چادر۔ سردی اتنی شدید کہ نہ بندہ نہ پرندہ نظر آئے پھر مایوس ہوکر وہاں سے اٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بے دلی سے رسیور اٹھایا کہ دوسری طرف کوئی انگریزی بولنے والا ہی ہوگا وہ بھلا کیا بات کرسکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ یگم جاگ جاتا اس نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو۔''

''ہیلو، ازاٹ مسٹر جیکسنز ریزیڈنس؟''

''رانگ نمبر۔''

ابھی وہ ریسیور رکھنے ہی لگی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی ''ہیلو ہیلو، بند مت کریئے۔''

''جی'' اسے خوشی محسوس ہوئی ایک ہم زبان سے مخاطب ہوکر۔

''آپ کہاں سے ہیں؟''

''ہندوستان سے۔''

''پنجاب سے؟''

''آپ نے کیسے جانا؟''

''آپ کا تلفظ بتا رہا ہے۔''

''اور آپ؟''

''میں بھی پنجاب سے ہی ہوں۔''

''اچھا! کہاں سے؟''

''پٹیالہ سے۔ آپ کس کے پاس آئی ہیں؟''

''بیٹی اور داماد کے پاس۔''

''پرمانٹ رہنے؟''

''نہیں نہیں، بس چھ ماہ کے لیے ہی آئی ہوں۔ بیٹی کے بیٹا ہوا ہے اس لیے اس کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہوں۔ پرمانٹ نہیں رہنا چاہتی۔''

''کیوں کیا خرابی ہے یہاں؟''

''خرابی یہاں کی زندگی میں نہیں مگر میرا تو دل ہی نہیں لگا۔''

''لگتا ہے پیچھے بھی آپ کے اپنے رہ گئے جو دل نہیں لگ رہا۔''

''بالکل ٹھیک۔ گھر میں بیٹا، بہو اور پوتی بھی ہے۔''

''اسی لیے آپ کا دل نہیں لگتا ورنہ یہاں سرکار نے جو سہولتیں بزرگوں کو مہیّا کرا رکھی ہیں وہ وہاں کہاں۔ وہاں تو بہت کم خاندان ایسے ہیں جو بزرگوں کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں، میرا بیٹا اشوک بہت ہی فرماں بردار بچہ ہے۔ بہو اس سے بھی زیادہ اچھی اور پوتی وہ تو میری جان ہے۔''

''پھر تو آپ بڑی خوش نصیب ہیں۔ نہیں تو آج کل کہاں ملتی ہے ایسی اولاد۔''

''تبھی تو جانا چاہتی ہوں واپس ان کے پاس۔''

''چھ مہینے بعد آپ اپنے بچوں کے ساتھ ہوں گی۔''

''بچوں کے ساتھ تو آج بھی ہوں مگر یہاں وقت نہیں ہے کسی کے پاس بات کرنے کو۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے پنجاب میں تو لوگ اجنبی کو بھی کتنی جلد اپنا بنا لیتے ہیں۔ یہاں تو میں منہ کھولنے کو ترس جاتی ہوں۔''

''چلیے، آپ کی یہ شکایت بھی دُور کر دیتے ہیں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ہر دوسرے دن آپ کو فون کر سکتا ہوں اور آپ بے جھجک اپنے دل کی بات مجھ سے کر سکتی ہیں۔ آپ کا دوست بن کر سب سن لوں گا۔ میرے پاس وقت ہی وقت ہے اور پھر ہم زبان، ہم وطن

ہونے کا کوئی تو فائدہ ہو۔"

ادھر سے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔

"آپ کو کس بات پر ہنسی آئی؟"

"اب اس عمر میں میں آپ کو دوست بنا لوں۔ بچے کیا کہیں گے؟"

"اس میں کیا برائی ہے، دوستی ہی تو ہے اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ آپ کینیڈا میں ہیں پنجاب میں نہیں۔ کچھ تو اثر ہونا چاہیے مغربی تہذیب کا۔ اپنے اِردگرد کے ماحول کا۔"

وہ کچھ سوچنے لگی اور ابھی کسی نتیجے پر پہنچ بھی نہ پائی تھی کہ ادھر سے یہ کہہ کر کھنّہ صاحب نے فون بند کر دیا کہ:

"چلیے پرسوں فون کروں گا اسی وقت۔"

وہ دن اس کا بہت اچّھا گزرا۔ اس نے چاہا کہ مندیپ اور داماد سے آج کا سارا قصّہ بیان کر دے مگر نہ ہی وقت ملا اور نہ ہی موقع۔

بدھ وار صبح سے ہی اسے فون کا انتظار شروع ہو گیا تھا۔ وہ فون والے کمرے کے آس پاس ہی کام میں مصروف رہی مگر لاشعوری طور پر وہ فون سے جڑی رہی۔ ٹھیک مقررہ وقت پر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور دوسری طرف کھنّہ صاحب وعدے کے مطابق حاضر تھے۔ اس دن کے بعد تو یہ معمول بن گیا۔ وہاں سے دو گھنٹے کے فاصلے پر تھے اور ایک دن چھوڑ کر فون کر لیتے۔ چھٹی والے دن فون نہیں کرتے تھے۔ کھنّہ صاحب نے بتایا کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بیٹے کے پاس یہاں آئے تھے اور اب وہ یہاں کے پرمانٹ رہائشی ہیں۔ چھ ماہ وہ یہاں رہتے ہیں اور چھ ماہ ہندوستان میں۔ یہاں سے بھی انھیں پنشن ملتی ہے۔ وہ بیٹے اور اس کے پریوار کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا ہیں کیونکہ کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنا وقت لائبریری میں کتابیں پڑھ کر یا پھر گھوم پھر کر گزارتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی اپنے پریواروں کے ساتھ خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہاں ان کے

ہمدرد، احباب اور رشتے داروں کی خاصی تعداد ہے جن کے ساتھ ان کا وقت اچھا گزر جاتا ہے جو ان کی ایک آواز پر بھاگے چلے آتے ہیں۔

کھنہ صاحب کے چلے جانے سے وہ ایک ہمدرد کھو دے گی۔ اسے بھی واپس جانا ہے اپنے گھر اپنے بچوں کے پاس۔ یہ ہی سوچ کر اس نے رات کے کھانے پر جانے کی بات چھیڑ دی۔

''تم میرا ٹکٹ کنفرم کروالو۔ چھ مہینے ہونے والے ہیں۔ اشوک بھی اُداس ہو گیا ہے۔''

''آپ کہاں جارہی ہیں؟'' بیٹی نے پوچھا۔

''کہاں سے مطلب؟ واپس اپنے گھر اور کہاں۔''

''آپ کہیں نہیں جارہی ہیں، آپ ہمارے پاس ہی رہیں گی۔ اشوک کا کوئی زیادہ حق نہیں آپ پر۔''

''مگر میں تو مہمان ہوں تمھاری ایک نہ ایک دن تو لوٹنا ہی ہے مجھے اپنے گھر۔''

''آپ کو کوئی تکلیف ہے یہاں؟'' داماد بہت دیر سے ماں بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔

''تکلیف تو کوئی نہیں، بس میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ تم جلد سے جلد میرا ٹکٹ کا انتظام کرلو۔''

''ہم تو سوچ رہے تھے کہ آپ کو یہاں کی پی آر مل جائے تو آپ کا بڑا فائدہ ہو جائے گا۔''

''نہیں بھگوان کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس۔ میں کون سا بار بار آنے والی ہوں یہاں۔ ایک بار آگئی بس بہت ہے۔''

کھانا ختم ہو گیا تو داماد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا جدھر بیگم آرام کی نیند سو رہا تھا۔ ماں بیٹی بھی اٹھیں اور کچن سمیٹ کر جب وہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو مندیپ بھی ساتھ چلی آئی۔

''ماں اگر آپ رُک جائیں تو ہمیں اچھا لگے گا۔''

''تو سمجھتی کیوں نہیں۔ اب میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں۔ میں اس سونے کے پنجرے

سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ میرا بس چلے تو ابھی اُڑ کر واپس چلی جاؤں اپنے وطن۔''

''آپ کو میری کوئی پروا نہیں؟'' وہ رونے لگی۔

''تو ایسے کیوں سوچتی ہے پروا ہے تو آئی ہوں نا۔''

''آپ نے دیکھ لیا نا یہاں زندگی کتنی مشکل ہے۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ اپنا گھر بنالیں۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم لوگ اپنا گھر خرید لو گے۔''

''آپ واپس جانے کی ضد کریں گی تو یہ ممکن نہیں۔''

''میرے یہاں رہنے سے مکان خریدنے کا کیا تعلق؟''

''کچھ نہیں۔ اگر آپ رُک جاؤ تو ہمیں خوشی ہوگی اور یگم بھی تو کتنا ہل گیا ہے آپ سے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر سے یگم کے زور زور سے چلانے کی آواز سن کر وہ ماں کو گڈ نائٹ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے روز صبح ہی معمول کی طرح مندیپ اور اس کا شوہر کام پر چلے گئے اور اس نے بھی ہر دن کی طرح ایک اور دن گزار دیا۔ اسے امید تھی کہ رات کو مندیپ کچھ بات ضرور کرے گی اس کے واپس جانے کے بارے میں مگر جب اس نے کوئی بات نہ کی تو اس نے ہی اشوک کا ذکر چھیڑ دیا۔

''کئی دنوں سے فون نہیں آیا اشوک کا۔ تمھاری بات ہوئی کیا؟''

''چھٹی والے دن بات کریں گے اس سے، ابھی تو وقت نہیں ملا۔''

وہ یہ سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ کیا زندگی ہے اور کیا وقت آ گیا ہے کہ اپنوں سے ہی بات کرنے کا وقت نہیں۔

یگم کو نہلا دُھلا کر دودھ پلا کر ابھی سُلایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اسے معلوم تھا فون کھنہ صاحب کا ہی ہوگا کیونکہ ان کا فون مقرر دن اور مقرر وقت پر ہی آتا تھا۔

''ہیلو۔''

''کیسی ہو۔''

''اچھی ہوں۔ آپ بتایئے تیاری ہو گئی جانے کی۔''

''بس ہو رہی ہے۔ تم بتاؤ بات ہوئی کیا۔''

''ہاں، وہ تو ابھی ضد کر رہی ہے رُک جاؤ پی آر ملنے تک مگر مجھے نہیں چاہیے پی. آر، وی آر. کہہ دیا میں نے۔''

''پھر؟ کب جانے کا پروگرام بنا؟''

''دیکھو کب بنتا ہے۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنا مکان لینے کی سوچ رہے ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مکان کا میرے جانے نہ جانے سے کیا تعلق ہے؟''

دوسری طرف سے ایک زوردار ٹھہاکے کی آواز آئی۔

''کیا ہوا؟ ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ہنسوں نہیں تو کیا کروں۔ تمھاری کہانی بھی مجھ جیسی ہی نکلی۔''

''وہ کیسے؟''

''یہاں بچّے ماں باپ کو عقیدت یا محبت کی وجہ سے پاس نہیں رکھتے بلکہ وہ تو اس لیے انھیں برداشت کرتے ہیں کہ ان کو سرکار سے پنشن لگ جائے اور وہ اپنے قرض کی قسط اس پنشن سے اُتارتے رہیں۔ خوشحال زندگی بسر کرنے کے لیے یقیناً ہم کسی سیڑھی سے کم نہیں۔''

یہ سن کر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ وہیں صوفے میں دھنس گئی۔

OO

ناکردہ گناہ کے مجرم

پرانی دلّی کے سلیم پور علاقے کی تنگ گلیوں سے ہوکر اس مکان تک پہنچنا پڑتا تھا۔ گلی کے دونوں جانب تین تین چار چار منزلوں والے مکان بالکل ایک دوسرے سے منہ جوڑے محسوس ہوتے تھے۔ اوپر کی منزل اور چھت سے آس پاس کے گھروں کے اندر کا نظارہ بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ مہیش جس فیکٹری میں بحثییت اکاؤنٹینٹ کام کرتا تھا وہ گھر کے نزدیک ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بیوی کے لاکھ کہنے کے باوجود وہ گھر بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ یو پی کے چھوٹے سے قصبے سے نکل کر وہ اس مہانگری میں آن بسے تھے جہاں ملک کے ہر صوبے اور ہر مذہب کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ مندر سے گھنٹیاں اور مسجد سے اذان کی آوازیں ان کے گھر تک صاف سنائی دیتی تھیں۔ صبح مہیش دفتر جانے سے پہلے اپنے آٹھ سال کے بنٹی کو اسکول بس تک چھوڑ کر آتا جو گلی سے کچھ دور بازار میں رُکتی تھی۔ سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کے رش کی وجہ سے وہ اسے اکیلے نہیں بھیجتے تھے۔ دوپہر کو پشپا خود بنٹی کو لینے جاتی۔ پتی اور بیٹے کو بھیج کر وہ گھر کے کام کاج میں مصروف ہوجاتی۔ جب کام کاج سے تھک جاتی تو کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے وہ بالکونی میں آ کر بیٹھ جاتی۔ بند کمروں میں اس کا دم گھٹتا تھا مگر اب چند دنوں سے اسے یہ سب مجبوری میں بند کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ بنٹی کی دلچسپی سامنے والوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔

بنٹی کے بالکل سامنے والے گھر کے داہنی طرف کے ایک مکان کو چھوڑ کر ہیجڑوں کا گھر تھا جس میں تقریباً چھ ہیجڑے رہتے تھے۔ ہیجڑوں کی یہ پرمپرا ہے کہ تقریباً چھ سات

لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اور سب کو 'چیلا' کہا جاتا ہے، ان میں سے سب سے بزرگ کو چھوڑ کر جسے 'گُرو' کا خطاب دیا جاتا ہے وہ نہ صرف گھر کا سب سے بڑا ہوتا ہے بلکہ اس کے چیلے اس کے خاندانی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ روزی روٹی کمانے کے لیے انھیں ناچ گانے اور دوسرے کاموں میں ٹریننگ دی جاتی ہے اور پیسہ کما کر لانا چیلوں کا کام ہے۔ وہ اپنی کمائی گُرو کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں جو سب کی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔ ہر گھرانے کی اپنی پرمپرا اور اپنے اصول ہوتے ہیں جسے اس گھر کا ہر فرد مانتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے۔ خدا نے انھیں غیبی طاقت بخشی ہے۔ اسی لیے لوگ ان سے گھبراتے، کتراتے اور ڈرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اپنی ہی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ اس گھر کے افراد بھی صبح سویرے ڈھولک اور باجا لے کر روزی روٹی کمانے نکل جاتے ہیں۔ شادی بیاہ یا جس گھر میں لڑکا پیدا ہوتا ہے ان کے ہاں ناچ کر بدھائی لے کر اور ڈھیروں دعائیں دے کر شام کو گھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کے صبح گھر سے نکلنے اور بنٹی کے اسکول جانے کا ایک ہی وقت ہے۔

کچھ دنوں سے بنٹی کی دلچسپی ان لوگوں میں بڑھ گئی تھی۔ ان میں سے ایک شبنم نام کے ہیجڑے سے اس کی ہلکی سی جان پہچان بھی ہوگئی تھی، جو ماں کے لیے باعثِ فکر تھی۔ شام کو جب اس گھر کے آنگن سے ڈھولکی اور باجے کی آوازیں شروع ہوتیں تو وہ کتابیں چھوڑ کر بالکونی میں آجاتا اور اس کی پوری توجہ اور نظریں اس گھر کی طرف ہوتیں۔ بنٹی بچپن کی معصومیت سے لبریز دنیا کی اونچ نیچ سے بے نیاز اس آواز کی طرف کھنچتا چلا جاتا۔ اسے کوئی غرض نہ تھی کہ دنیا والے ان کو نفرت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ ان سے ملنا جلنا کیوں پسند نہیں کرتے۔ اسے تو وہ آوازیں اچھی لگتی تھیں۔ پشپا نے جب بنٹی کی یہ دلچسپی نوٹ کی تو اس نے شام کو باہر بالکونی میں بیٹھنا بند کر دیا اور بیٹے کو بھی باہر کھڑے ہونے پر پابندی لگا دی۔ معصوم ذہن اس روک ٹوک کی وجہ سمجھ نہیں پایا۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پایا کہ اس کے دوست اور گلی کے بڑے لڑکے ان کو دیکھ کر ہنستے کیوں ہیں اور ان کی پیٹھ پیچھے انھیں 'چھکا' کیوں کہتے

ہیں۔ایک گرمیوں کی شام بچے اس تنگ گلی میں کھیل رہے تھے اور وہ بھی ماں سے پوچھ کر ان کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔کھیلتے کھیلتے شام ڈھل گئی۔ادھر اس گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔اس کا چنچل من کھیل سے اکھڑ گیا اور اس گھر کی طرف جانے کو مچل اٹھا۔پہلے اس نے اپنے گھر کی بالکونی کی طرف دیکھا۔ماں وہاں نہیں تھی۔پھر وہ دوستوں کی نظریں بچا کر اس گھر کے آنگن میں پہنچ گیا۔وہاں سبھی گانے اور بجانے میں اتنے مست تھے کہ کسی کو اس کے دبے پاؤں آنے کی آہٹ بھی سنائی نہ دی۔پانچ منٹ وہ یوں ہی کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔پھر وہ جیسے ہی جانے کو مڑنے لگا شبنم نے اسے آواز دے کر روک لیا ''بنٹی ! سنو،آؤ۔جا کیوں رہے ہو؟''

اپنا نام سن کر وہ چونکا اور وہیں رُک گیا۔

''آپ کو میرا نام پتہ ہے؟''

''بالکل پتہ ہے۔تم سامنے والے گھر کی پہلی منزل پر رہتے ہونا؟''

''ہاں۔''

''کہو کیسے آئے؟''

''ایسے ہی......''

''ہمارے پاس آؤ۔'' اس نے اسے اپنے پاس بلایا۔گانا بجانا رُک چکا تھا اور سبھی ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔

''نہیں ممی مارے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ وہاں سے بھاگ گیا۔شبنم اس کے پیچھے اسے روکنے کو نکلی بھی پر وہ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ادھر پشپا اسے بچوں کے ساتھ نہ کھیلتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہوئی اسے ڈھونڈ رہی تھی۔بنٹی کو اس گھر سے نکلتا دیکھ کر خوف اور غصّے سے چلائی اور وہیں کھڑے کھڑے اسے دو چانٹے رسید کر دیے۔کس کر اسے بازو سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی گھر لے گئی۔شبنم نے یہ منظر اپنے دروازے پر کھڑے دیکھا اور پلٹ کر اپنے آنگن میں اپنے ساتھیوں میں پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟" گرو نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، وہی قصہ وہی کہانی۔ بچّے کو ہمارے یہاں آنے کی سزا مل گئی۔"

مہیش رات کو دفتر دیر سے گھر لوٹا تو پشپا نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا۔

"میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مکان بدلو مگر آپ ہیں کہ آپ کو کوئی پروا ہی نہیں۔ ایک ہی اولاد ہے ہماری کہیں ہم اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ آئے دن ایسی خبریں سننے کو ملتی رہتی ہیں کہ یہ لوگ بچے کا آپریشن کروا کر زبردستی اسے اپنے قبیلے میں شامل کر لیتے ہیں۔ آج یہ ان کے آنگن تک پہنچا ہے کل گھر تک بھی پہنچ جائے گا۔ اگر تم سے کچھ نہیں بن پاتا تو ہم دونوں کو گاؤں واپس بھیج دو۔"

"تم فکر مت کرو۔ میں جلد ہی کچھ کرتا ہوں۔ تم بس بنٹی پر پوری نظر رکھو۔"

"ماں کی سختی بڑھتی گئی تو بنٹی کی اس گھر کے لوگوں سے ملنے کی چاہ بھی بڑھتی گئی۔ اس روز کے واقعے کے بعد گلی میں آتے جاتے شبنم بنٹی کو آواز دے کر بلا لیتی تھی۔ بنٹی کی معصوم چاہ اسے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ کبھی وہ بچوں میں کھیل رہا ہوتا اور پشپا اپنی بالکونی سے ہی اس پر نظر رکھے کھڑی ہوتی تو شبنم کو اس سے بات کرتا دیکھ کر پریشان ہو اٹھتی۔ حالانکہ وہ صرف دو ٹک ہی بات کرتے تھے۔

"کیسا ہے رے تو بنٹی۔"

"ٹھیک ہوں۔"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور ہاتھ ہلا کر ہیلو کر لیتے۔ ان کی اتنی سی رفاقت بھی آس پڑوس والوں کے لیے ایک مدعا بن گئی تھی۔ شام کو جب وہ عورتوں کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی تو یہ بات بھی نکل پڑی۔

"ذرا بنٹی کو بچا کر رکھو، سامنے والوں کی نظر ہے اس پر۔"

"تم اپنے بنٹی کو روکتی کیوں نہیں اس سے بات کرنے کو۔ دیکھ لینا اگر یہی سب چلتا رہا تو ہاتھ دھو بیٹھو گی اپنے بیٹے سے۔"

پشپا نے بنٹی کو باہر اکیلے بھیجنا ہی بند کر دیا۔ خود بھی وہ عورتوں میں کھڑی نہیں ہوتی تھی اگر اسکول جاتے وقت شبنم بنٹی سے نہ مل پاتی تو اس کی نظریں بالکونی کی طرف اٹھی رہتیں۔ پشپا سب دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی مگر زبان سے کچھ نہ کہہ پاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ غصّے میں کوئی ایسی بات اس کی زبان سے نکل جائے جس سے شبنم کے دل کو ٹھیس پہنچے اور اس کے بیٹے کو کوئی بد دعا لگ جائے۔ اس نے دن رات صرف مکان بدلنے کی رَٹ لگا رکھی تھی۔ مہیش کوشش تو کر رہا تھا مگر جو بھی مکان پسند آتا کرایہ اس کی پہنچ سے باہر ہوتا۔

معمول کی طرح اس روز بھی مہیش بنٹی کو اسکول بس چڑھانے گیا۔ دونوں کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار گاڑی ان دونوں کو ہٹ کر کے بھاگ گئی۔ ٹکّر اتنی زور کی تھی کہ بنٹی گرتے ہی بے ہوش ہو گیا اور مہیش لہولہان سڑک پر چلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا اکٹھی ہو گئی مگر کسی نے بڑھ کر انھیں اٹھایا نہیں۔ مہیش زور زور سے چلاّ رہا تھا ''کوئی مدد کرو، میرے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔''

مگر اتنی بھیڑ میں کوئی بھی ایسا حوصلہ والا درد مند مرد نہیں تھا جو آگے بڑھ کر ان کی مدد کرتا۔ اتنے میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے کچھ لوگ آگے بڑھے اور سب کو پیچھے ہٹا کر بنٹی اور اس کے باپ کو گاڑی میں ڈال کر قریبی اسپتال کی طرف لے گئے۔ کچھ ہی دیر میں حادثے کی خبر پشپا تک بھی پہنچ گئی۔ پاگلوں کی طرح روتی چلاتی حادثے والی جگہ پہنچ گئی۔ تب تک پولیس بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ سڑک پر خون ہی خون دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ دہشت سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے پورا خون نچوڑ لیا ہو۔ پڑوس والے مشرا جی بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے اسے سہارا دیا اور لوگوں کے بتانے پر اسے اسپتال لے گئے۔ اس اجنبی شہر میں کوئی بھی اپنا سگا سمبندھی نہ تھا جس سے وہ امداد کی توقع کرتی۔ اسے گھر سے باہر کی دنیا کا بالکل بھی علم نہیں تھا۔ مہیش کو اسٹریچر پر لیٹے جب ڈاکٹروں سے بات کرتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے پتی کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا

کہ اس نے دوسرا سوال داغ دیا۔ ’’بنٹی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟‘‘

’’آپ آ کر ادھر بیٹھیے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’کیا ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب۔ ذرا جلدی بتایئے میرا بنٹی کہاں ہے؟‘‘

’’سر پر چوٹ لگی ہے اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آپ بس ہمّت سے کام لیں اور خون اور پیسوں کا انتظام کر لیں۔‘‘

’’کتنے پیسے چاہیے ہوں گے؟‘‘ پشپا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

’’پچیس ہزار تو ابھی جمع کروانے ہیں باقی بعد میں دیکھتے ہیں۔‘‘ اتنی رقم سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کا شوہر خود بستر پڑا ہے ایسے میں بھلا اتنی بڑی رقم کا وہ کیسے انتظام کرے گی۔ اس نے مشرا جی کی طرف بڑی امید سے دیکھا مگر انھوں نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ پھر مہیش کے پاس گئی اور اسے اس مصیبت کا حل نکالنے کو کہا۔ اس نے دو تین دوستوں کے فون نمبر دیے اور کہا کہ ان سے بات کر لو۔ جس جس کو اس نے فون کیا انھیں سن کر بے حد دکھ ہوا اور انھوں نے فوراً ہسپتال آنے کی خواہش بھی ظاہر کی مگر مالی امداد کی بات پر سب نے اپنی اپنی مجبوریوں کا رونا رو دیا۔ ڈاکٹر نے آ کر ایک بار پھر پیسہ جمع کرانے کو کہا۔ تو اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی ’’ڈاکٹر صاحب آپ فکر مت کریں ہم رقم کا انتظام کر رہے ہیں، بس آپ علاج شروع کر دیجیے۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’آپ شکر کرو کہ ان لوگوں کو وقت پر یہاں لے آئے اور ہم نے علاج شروع کر دیا۔ اگر کسی سرکاری اسپتال میں لے جاتے تو ابھی تک پولیس کارروائی چل رہی ہوتی۔ آپ خون کا انتظام بھی کر لیں۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔‘‘ اتنا کہہ کر ڈاکٹر تو چلا گیا اور وہ مہیش سے بولی۔ ’’میں گھر جا کر زیور نکال لاتی ہوں۔ مشرا جی سے کہوں گی وہ انھیں بیچ آئیں گے۔‘‘

مہیش بے بسی اور لاچاری سے اسے دیکھتا رہا۔ آنکھوں سے پانی چھلکنے لگا اور اس نے

'ہاں' میں سر ہلا دیا۔

''ان سب کی اب ضرورت نہیں ہے ممی جی۔ آپ فکر نہ کریں سب انتظام ہو گیا ہے۔''

دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو شبنم اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں کھڑی تھی۔

''پیسے ڈاکٹر صاحب کے پاس جمع کروا دیے ہیں اور تین لوگ پکڑ کر لائے ہیں جو خون دیں گے۔ اب آپ بس دُعا کرو کہ بنٹی جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔''

''خون کون دے رہا ہے؟''

''فکر مت کرو، وہ ہم جیسے نہیں آپ جیسے ہیں۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے۔''

مگر آپ کو پتہ کیسے لگا اس حادثے کا؟ وہ حیران تھی انھیں یہاں دیکھ کر۔

''پشپا! یہ لوگ ہی تو لائے تھے ہمیں اسپتال میں۔ اتنی دنیا جمع تھی مگر مدد کے لیے کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ یہ تو بھگوان کا رُوپ بن کر آئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی پشپا کے روم روم سے دعائیں نکلیں اور وہ آگے بڑھ کر شکریہ ادا کرنے کے لیے شبنم کے پیر چھونے لگی تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ ''یہ کیا کر رہی ہیں ممی جی؟ ہم بھی انسان ہیں، ہمارے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ پیار، ہمدردی اور درد کا جذبہ ہمارے پاس بھی ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ ہم نے تو اپنا فرض پورا کیا ہے کوئی احسان نہیں کیا۔ آپ تو پڑوسی بھی ہیں ہمارے۔''

یہ، سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی طرف سے ایک ایسا طمانچہ تھا جس کی ٹیس وہاں کھڑے سبھی لوگوں نے محسوس کی۔

OO

چھُٹتی کہاں ہے کافر...

بیس سال کی نوکری میں اس نے کوئی بھی کام بنا پیسے لیے نہیں کیا تھا۔ کئی افسر آئے کئی گئے مگر اس کے کام کرنے کا ڈھنگ نہیں بدلا۔ اس کی سیٹ ایسی تھی کہ اس کی منظوری کے بغیر کام آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے نقشے پاس کرتا تھا اور ہر کیس میں وہ پیسہ پلاٹ کا رقبہ دیکھ کر لیتا تھا، جتنا بڑا پلاٹ اُتنی بڑی رقم۔ نیچے سے لے کر اوپر والوں کا منہ بند کرنے کے لیے سب کا حصّہ وصول کر لیتا تھا۔ آج دفتر میں ایک فون آیا اور بڑے صاحب نے اسے دریافت کر لیا۔ صاحب آگ بگولا ہو رہے تھے: ''کتنے سال ہو گئے آپ کو نوکری کرتے؟''

تقریباً بیس سال۔ کیوں کوئی خاص بات؟''

''خاص بات یہ کہ کتنی بار آپ کو کہا ہے کہ احتیاط سے کام کیا کرو۔ آپ جیسے تجربہ کار آدمی سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

''مگر صاحب ہوا کیا؟ کوئی شکایت آئی ہے کیا؟''

''بالکل آئی ہے اور وہ آدمی تیار بیٹھا ہے پریس میں جانے کو۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اگر یہ معاملہ پریس میں چلا گیا یا اوپر تک پہنچ گیا تو کوئی بھی آپ کی مدد نہیں کر سکے گا۔ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا وہ الگ۔''

''شکایت کی کہیں کسی نے؟''

''حال ہی میں جس سے آپ نے بیس ہزار روپے لیے ہیں۔''

''شری رام انڈسٹری؟''

''جی شری رام انڈسٹری۔''

''مگران کا کام تو ہو گیا ہے۔''

''اوراس نے سارے ثبوت اپنے پاس تیار کر لیے ہیں۔''

''کیسے ثبوت ہیں۔''

''اس نے وہ گفتگو اپنے موبائل میں رکارڈ کر لی ہے جس میں آپ نے بیس ہزار کا تقاضہ کیا ہےاوراب وہ دھمکی دے رہا ہے کہ وہ پریس میں جائے گا اوپر تک جائے گا۔''

یہ سنتے ہی اس کا دماغ ہل گیا۔ آنکھوں کے آگے جوان بیٹا، بیٹی کے سسرال والے، گلی محلے والے جو اسے بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، سب گھوم گئے۔ دفتر سے نکالے جانے کے خوف سے وہ لرز اٹھا۔ رُسوائی، ذلّت، شرمندگی، کے ڈر سے اس کا پورا وجود کانپ گیا۔ کھڑے کھڑے وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔

''اب کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جا کر ملو اس آدمی سے اور ثبوت حاصل کرو۔ ایک بات یاد رکھنا اگر کچھ بھی غلط ہوا تو اس کے ذمّے دار تم خود ہو۔ میں بھی ساتھ نہیں دوں گا۔ مجھے ابھی اپنے بچے پالنے ہیں۔'' وہ جیسے ہی باہر نکلنے لگا۔ صاحب نے پھر پیچھے سے کہا ''شام تک مجھے رپورٹ دے کر جانا۔''

''جی۔ اتنا کہہ کر وہ کچھ سوچتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ چہرے کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔ اپنی سیٹ پر جانے کے بجائے وہ دفتر سے باہر نکل گیا۔ دو گھنٹے بعد وہ پھر صاحب کے کمرے میں تھا۔ اس کا پُرسکون چہرہ دیکھ کر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''کیا خبر ہے؟''

''خبر ٹھیک ہے۔ بس آپ جلدی سے چائے منگوایئے۔''

''ثبوت دے دیے اس نے؟''

''خریدے ہیں۔''

''خریدے ہیں؟ کتنے میں؟''

''پچاس ہزار میں۔''

صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بات کرتے وہ جھٹ سے بول اٹھا ''فکر کی کوئی بات نہیں سر۔ دو کیس تیار ہیں بس پچاس ہزار پورا ہو جائے گا۔''

OO

عام طور پر اچھا ادب وہ سمجھا جاتا ہے، جو اپنے دَور کا عکاس ہو۔ اس سے بھی اچھا ادب وہ ہوتا ہے جو اپنے دَور کی عکاسی تو کرتا ہی ہو، ساتھ ہی ساتھ اُس میں ماضی کی جھلک بھی ملتی ہو اور مستقبل کی تلاش بھی۔ ایسا ادب جہاں وقت کی حدود کو توڑ کر ایک طرح سے ہر دَور کا نمائندہ ادب بن جاتا ہے، وہاں وہ جغرافیائی حدوں کو پھلانگ کر کُل عالم کا ادب بن جاتا ہے۔ ہر عہد میں آنے والا فرد اُسے اپنا لیتا ہے۔

پچھلے چند سالوں سے مَیں رینو بہل کی کہانیوں کو غور سے پڑھتا رہا ہوں۔ جس لگن سے وہ کہانی لکھنے اور اپنے عہد کے درد کو بیان کرنے میں لگی ہیں، اس سے اُمید بندھتی ہے کہ وہ اُردو ادب میں اپنی الگ چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہوں گی۔ 'بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'، 'لغزشِ آدم' اور 'سیڑھی' جیسی کہانیاں یقیناً اُنھیں منزل کی طرف گامزن کر رہی ہیں۔

—— رتن سنگھ